ناولٹ

لالۂ صحرائی

بشریٰ رحمٰن

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ ایجنسی کی ایجنسی پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری
مجدد یہ روڈ محلہ عید گاہ روڈ ٹوبہ
وطن دوست لمیٹڈ

چولستان کی زمین سے پھوٹنے والے ——————
پہلے ٹھنڈے اور میٹھے ——————
پانی کے نام!

"کوئی مجھے گالی دے یا میری غیبت کرے ——————
یا ——————
مجھ سے خوبصورت پھولوں کی طرح محبت کرے ——————
میں اس سے بے نیاز ہوں!
کیونکہ میں امرت پی کر طاقتور ہو گئی ہوں ——————
میں اب نہ خوش ہوں نہ رنجیدہ!"

(لیلیٰ عارفہ)

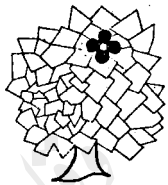

علی مرتضیٰ نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور نظر اٹھا کر دُور دُور تک دیکھا.... ہو کا سماں تھا۔ کوئی آواز کوئی گونج نہ اُبھر رہی تھی۔ رات بھی سیاہ تھی۔ البتہ ستارے چمک رہے تھے اور اس ریگستان میں ستاروں کی روشنی مشعل کا کام دے رہی تھی۔ علی مرتضیٰ کو حیرت بھی ہو رہی تھی۔ وہ کبھی آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا۔ اور کبھی سیاہی مائل بھوری زمین کی طرف دیکھتا۔ زمین کا کوئی خاص رنگ محسوس نہیں ہو رہا تھا یوں بھی زمین رات کے وقت بدرنگ ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ صحرا کی زمین تھی۔ دُور تک ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی۔ البتہ ریت کے ذرات بھی ستاروں کی روشنی میں اور کبھی جیپ کی لائٹ میں چمک اٹھتے تو یوں محسوس ہوتا، راہوں میں موتی بچھے پڑے ہیں یا شاید پنگھٹ کی گوریاں صبح یہاں سے پانیں بجاتی ہوئی گزری ہوں گی اور راہوں میں موتی و ستارے رول گئی ہوں گی۔

ستارے تو آسمان پر بھی تھے ——

واہ —— اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ آسمان کتنا شاندار لگ رہا تھا۔ آسمان کی یہ آن بان اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ستاروں کی یہ چمک دمک بھی پہلے نہ دیکھی تھی اور آج ہی اس کی سمجھ میں آیا کہ آسمان اس قدر مغرور کیوں ہے؟ اور یوں سینہ تانے کیوں کھڑا رہتا ہے —— جس کی آغوش میں اتنے ستارے ہوں۔ اور اتنا نور ہو —— وہ مغرور کیوں نہ ہو ——؟

لیکن یہ شاعری کرنے کا وقت نہیں تھا۔ پچھلے ایک فرلانگ سے وہ جیپ کو دھکا لگاتا آ رہا تھا —— پاؤں کے نیچے کئی من ریت تھی۔ جیپ بھی ریت میں دھنسی جا رہی تھی اور وہ بھی گھٹنے گھٹنے ریت میں دھنسا جاتا تھا۔ پھر بھی ہر بار کھینچ کر اپنی ٹانگیں ریت میں سے نکالتا اور اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر جیپ کو دھکے دیتے جاتا۔

جیپ ذرا سا اسٹارٹ ہوتی اور پھر ذبح کی ہوئی مرغی کی مانند ذرا سا پھڑپھڑا کر بند ہو جاتی —— ڈرائیور محمد طفیل اپنی بیزار سی شکل کھڑکی سے باہر نکال کر اس کی طرف دیکھتا۔ جیسے کہہ رہا ہو "سب بے سود ہے ——"

مگر علی مرتضیٰ پھر ایک نئے عزم کے ساتھ جیپ کو دھکا لگانے لگتا —— اور ڈرائیور چابی لگا کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا۔

اس عمل کو کئی گھنٹے ہو گئے تھے۔ اور اب علی مرتضیٰ تھک گیا تھا —— پسینہ پونچھ کر وہ ایک طرف جا کے بیٹھ گیا، اسے بیٹھے دیکھ کر ڈرائیور نے بھی جیپ سے

باہر چھلانگ لگا دی —— باہر گرتے ہی وہ ریت کے ذروں پر پھسلا۔ سنبھلا اور اندر کو دھنسنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنا توازن برقرار رکھا۔ دل ہی دل میں صاحب کو کوسا جس کی خرمغزی نے یہ دن دکھایا تھا —— پھر اندر کو دھنستا نکلتا وہ گرتا پڑتا جا کر علی مرتضیٰ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

اُس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

جیب سے ریڈ اینڈ وائٹ کی ڈبیہ نکالی۔ علی مرتضیٰ کے آگے کی۔ اُس نے انکار میں سر ہلایا تو طفیل نے ایک سگریٹ نکال کر منہ میں رکھ لی۔ سگریٹ کو ماچس کا شعلہ دکھایا۔ اور آنکھیں بند کر کے پہلا طویل کش لیا۔ کش لیتے ہی جیسے اُس کا سر ٹھکانے آ گیا —— اُس نے آنکھیں نیم وا کر کے اور بھی کئی کش لئے .... دھوئیں کے بہت سے مرغولے چھوڑنے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ وہ زندہ ہو گیا ہے۔

آہ سگریٹ بھی کیا عجیب نعمت ہے ——

اُس نے دل میں سوچا، تھوڑی دیر پہلے اُس کی حالت نیم مُردہ انسان کی سی تھی۔ کڑوے دھوئیں نے اس کے اندر جان ڈال دی۔

اگر مرنے سے پہلے عزرائیل اسے ایک کش لگانے کی اجازت دے دے تو پھر اُس کی جان آسانی سے نکل جائے گی۔

اس نے چاروں طرف اس بیابان کو دیکھا، دشت ہی دشت، صحرا ہی صحرا —— طویل سناٹا اور وحشت ہی وحشت ——

یہ پڑھے لکھے لوگ بھی پاگل ہوتے ہیں۔ خبطی ہوتے ہیں۔ اُس نے چہرہ موڑ کر علی مرتضیٰ کو دیکھا۔ علی مرتضیٰ آنکھیں بند کئے کسی سوچ میں مگن تھا۔

پہلے تو اُس نے اپنے صاحب کو اس سفر پر آنے سے باز رکھا تھا۔ وہ جگہ جس کے بارے میں صرف سنا ہوا ہو۔ آدمی کچھ بھی نہ جانتا ہو۔ حتیٰ کہ راستوں اور موسموں سے بھی واقف نہ ہو، تو اس جگہ جانا حماقت نہیں تو اور کیا ہے ——— ؟

اور پھر وہ پچھلے چار گھنٹوں سے اسے کہہ رہا تھا کہ ہم راستہ بھول چکے ہیں ——— بھٹک گئے ہیں۔ یہاں کوئی راستہ نہیں، پگڈنڈی نہیں ——— مگر علی مرتضیٰ مانتا ہی نہیں تھا۔ کہہ رہا تھا چلے چلو ——— کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکل آئے گا۔

راستہ کیا نکلتا ——— ! جیپ نے ہی جواب دے دیا۔

دھکے لگاتے لگاتے صاحب کی ہمت نے جواب دے دیا۔

سر پر تپتی رات، نہ کھانے کو نہ پینے کو ——— نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔

پتہ نہیں وہ کہاں تھے، کس جگہ تھے۔ یہاں صبح بھی ہوتی ہے یا نہیں ——— ہوتی ہے تو کب ہوتی ہے ——— اس بیابان کے درندے پتہ نہیں کس قسم کے ہوں گے ؟ پھاڑ کھاتے ہوں گے یا سالم نگل لیتے ہوں گے۔

محمد طفیل کو ایک جھرجھری آگئی۔

گھڑی پر وقت نظر نہیں آرہا تھا ——— مگر کلائی پر بندھی گھڑی کی ٹک ٹک صاف سنائی دے رہی تھی۔

اُف کس قدر سناٹا ہے۔

کلائی کی گھڑی کی ٹک ٹک تو صرف بستر میں سنائی دیتی ہے

پتہ نہیں یہ کیسی دُنیا ہے۔ کیسی زمین ہے ——— ! محمد طفیل حیرت زدہ ہو گیا۔

"صاحب جی"۔ اُس نے کش لگا کر سگریٹ ختم کر دیا۔

"کیا وقت ہوا ہے جی ——— ؟"

علی مرتضیٰ نے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا۔ جیسے گہری نیند میں سو گیا ہو۔ اُس کے کانوں میں بھی اُس کی کلائی کی گھڑی کی آواز گونج رہی تھی۔

ٹک ٹک . . . ٹک . . . ٹک . . . .

یا پھر دل دھڑک رہا تھا۔

دھک دھک . . . . دھک دھک . . . . دھک . . . .

ہاں سناٹا بھی بول رہا تھا ——— سناٹے کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ کوئی آواز نہیں ہوتی . . . . مگر سناٹا بولتا ہے ——— اس طرح بولتا ہے کہ آدمی کا اندر بے حجاب ہو جاتا ہے ——— شعور چھپ جاتا ہے۔ اور لاشعور بیدار ہو جاتا ہے ——— وجود گم ہو جاتا ہے۔ اور لاوجود سامنے آجاتا ہے۔

اس وقت ——— علی مرتضیٰ نے آنکھیں پھاڑ کر اپنی گھڑی دیکھی اور پھر "ڈجی ٹل" واچ کا بٹن دبا دیا۔ سرخ روشنی جل کر بجھ گئی۔ گھڑی ہندسوں کے نشان چھوڑ گئی۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں طفیل۔ !

"ساڑھے گیارہ ——" طفیل نے منہ پھاڑ کر کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ آدھی رات ہوگئی۔ اور آٹھ بجے سے ہم راستہ بھولے ہوتے ہیں۔ صاحب! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ وہیں رُک جاتے ہیں۔ وہاں کچھ کچھ روشنیاں بھی نظر آرہی تھیں! کا دکا درخت بھی تھے —— یہ زمین تو بیوہ عورت کی طرح اجاڑ ہی نظر آرہی ہے ——"

علی مرتضیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

علی مرتضیٰ کو پتہ تھا کہ وہ راستہ بھول چکے ہیں۔ اُس کی جیب میں ریگستان کا سارا نقشہ تھا مگر غلطی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ جب وہ اپنے دوست کے مجبور کرنے پر صادق آباد رک گیا تھا۔

صادق آباد میں اُس کا ایک عزیز دوست اویس رہتا تھا۔ اس نے اپنی آمد کی اطلاع اویس کو دے رکھی تھی۔ ذرا کی ذرا ملنے گیا تھا۔ مگر اویس نے تو جیسے اس کی آمد کی خوشی میں ایک زبردست ضیافت کا بندوبست کر چھوڑا تھا —— مرغابیاں ہرن، بٹیرے جو کچھ بھی وہاں سے شکار ہو سکتا تھا۔ اس کے پکوان پکاتے ہوئے تھے۔ اور صاف کہہ دیا تھا کہ کھانا کھائے بغیر آگے نہیں جانے دیا جائے گا۔ سو علی مرتضیٰ کو وہاں رُکنا پڑا۔ تین بجے دوپہر وہ کھانا کھانے سے فارغ ہو گئے تھے مگر اتنی مرغن غذائیں کھانے کے بعد، سفر کرنے کی ہمت نہ رہی —— کسلمندی سی طاری ہونے لگی تو اس نے اویس سے کہا۔

"یار کافی پلاؤ۔ تم نے اتنا کھلا دیا ہے کہ ہم سفر کے قابل نہیں رہے!"

پھر وہ لوگ کافی پیتے رہے —— گپ لگاتے رہے —— کھانا ہضم کرتے رہے۔ تاکہ سفر کے قابل ہو سکیں۔ چار بجے وہاں سے روانہ ہوئے۔

اویس نے بہت مجبور کیا تھا۔ آج رات یہاں رہ جاؤ۔ کل نمازِ فجر کے بعد سفر پر روانہ ہو جانا تو جلدی منزل آجائے گی۔" مگر علی مرتضیٰ ارادے کا آدمی تھا۔ وہ جب فیصلہ کر لیتا تو فوراً اس پر عمل درآمد کر دیتا۔ وہ کل پڑا لنے کا آدمی نہیں تھا ——

اُس میں اُمنگ تھی، جوش تھا، ولولہ تھا۔

اور سب سے بڑی بات کہ وہ جوان تھا۔

اس نے بڑی بڑی مہمات سر کی تھیں۔ مہمات اور سفر کی صعوبتوں سے وہ گھبراتا نہیں تھا اسلئے وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

اسے ریگستانی راستوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ کوہستانی راستے شہری راستوں سے لمبے ہوتے ہیں۔ مگر ریگستانی راستوں میں کیا قباحتیں ہوتی ہیں اس کا یہ تجربہ پہلا تھا۔ اُس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ راستوں میں یوں تہہ در تہہ ریت کے بستر بچھے ہوں گے —— پاؤں ایک ایک من کے ہو جائیں گے —— واقعی اونٹ کو اسی لئے صحرائی جہاز کہتے ہیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے اونٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔ کاش وہ لوگ اونٹوں پر آئے ہوتے —— اور لطف بھی کتنا آتا۔

"صاحب جی، رات کا کیا کرو گے پھر ——؟"

طفیل نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ وہ تنہائی اور صاحب کی خاموشی سے

وحشت زدہ ہو رہا تھا۔

"کچھ کرتے ہیں یار ——"، علی مرتضیٰ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اور پھر جیپ کے قریب جا کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ خیالوں کا سلسلہ پھر جُڑ گیا۔ . . . وہی ہوا جس کا خوف تھا۔ رات اُتر آئی، تاریکی بڑھی۔ اور وہ لوگ راستہ بھُول گئے۔ سفر شروع ہوا میں کچھ خودرو جھاڑیاں نظر آئیں —— دُور دُور خوف زدہ ہرن بھی کلانچیں بھرتے ہوئے نظر آئے —— جیپ کی روشنی دیکھ کر وہ یُوں متوحش ہو کر بھاگتے۔ جیسے دیہاتی دوشیزہ پہلی مرتبہ ہوائی جہاز دیکھ کر ڈر جاتی ہے۔ دُور دُور ننھی منی روشنیاں بھی نظر آئی تھیں —— ڈرائیور برابر چلائے جا رہا تھا —— مگر علی مرتضیٰ اسے اور آگے اور آگے بڑھنے کی ہدایات دیتا رہا —— حتیٰ کہ جیپ نے خود دم توڑ دیا —— ریت بہت دلدلی تھی۔ اور اس کی گرفت نے سخت جان پہیوں کو جیسے لہولہان کر کے رکھ دیا۔

کافی دُور تک علی مرتضیٰ نے دھکا لگایا تھا۔ اور طفیل کو جیپ میں بیٹھے بہت مزہ آ رہا تھا۔ صاحب کو اپنی ضد کی سزا ملنی چاہیئے تھی۔

اب وہ کھلے آسمان تلے، کھلی زمین پر کھڑے تھے۔

سمتوں کا کوئی تعین نہ تھا۔ اگر سر پہ آسمان نہ ہوتا۔ تو غالباً وہ سمجھتے کہ عالمِ بالا میں ہیں۔

"طفیل اپنا خیمہ نکالو۔ اور یہاں نصب کر لو ——"

طفیل ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"صاحب یہاں خیمہ کیسے لگے گا؟"

"میں تمہیں لگا کے بتاتا ہوں ——"

علی مرتضیٰ جیپ کے اندر گھُس گیا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے ڈرائیور بھی اندر آ گیا۔ ٹارچ جلا کے انہوں نے خیمہ نکالا۔ سلیپنگ بیگ نکالے —— چائے اور پانی کے فلاسک نکالے —— ہاٹ کیس نکالا —— ضرورت کی ہر چیز وہ ساتھ لاتے تھے۔

جیپ کے ساتھ باندھ کے علی مرتضیٰ نے خیمہ لگا دیا۔ اور ریت پر اپنا سلیپنگ بیڈ بچھا دیا۔ اس کے دیکھا دیکھی ڈرائیور نے بھی ویسا ہی کیا۔

"کھانا کھائیں گے صاحب ——؟" شاید طفیل کو بھُوک لگی تھی۔

"تم کھانا کھاؤ۔ مجھے کافی دے دو۔ اور ہاں دیکھنا صبح کے لئے پانی بچا لینا۔ یہاں پانی بالکل نہیں ہے ——"

کافی پی کر علی مرتضیٰ اپنے بستر پر چت لیٹ گیا۔

اُس نے جیب سے سگار نکالا۔ سلگایا —— اور ستاروں پر نظریں جما کر کش لینے لگا۔ سگار کی خوشبو جب طفیل کے نتھنوں میں پہنچی تو اس نے سوچا، اسی لئے صاحب نے ریڈ اینڈ وائٹ جیسا سگریٹ پینے سے انکار کر دیا تھا۔

مگر انہیں کیا پتہ پیٹ بھرا ہو تو "ریڈ اینڈ وائٹ" بھی امریکی سگار کا مزہ دیتا ہے۔

کش لگاتے لگاتے طفیل پر غنودگی طاری ہونے لگی . . . بہت زیادہ تھکا

ہوا تھا۔ ابھی دوپہر کا کھانا ہضم نہیں ہوا تھا کہ اس نے اور کھانا کھا لیا۔ یہ کھانا انہیں ادیس نے ہاٹ کیس میں بند کر کے ساتھ دے دیا تھا۔ مبادا رات کو کہیں کھانے کا بندوبست نہ ہو سکے۔

صحرا کی ہوائیں، الھڑ مٹیاروں کی مانند جب اپنے فرغل ہلاتی اُن کے اوپر نثار ہونے لگیں تو محمد طفیل کو نشہ سا آ گیا ——— چند منٹوں کے بعد اُس کے خراٹے سنائی دینے لگے۔

اس دشت وحشت میں یہ خراٹے بھی غنیمت ہیں۔

علی مرتضیٰ نے سوچا۔ زندگی کا احساس تو ہو رہا ہے۔ اگر وہ لوگ کسی آرام دہ سجے سجائے ریسٹ ہاؤس میں ہوتے تو وہ طفیل سے صاف کہہ دیتا۔

"کہ بھائی ادھر جا کر تو کروں کے کوارٹروں میں سو جاؤ میں تمہارے خراٹے برداشت نہیں کر سکتا۔"

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

یہاں لیٹ کر علی مرتضیٰ کو اندازہ ہوا کہ ہوا کتنی بے باک اور کتنی آزاد ہوتی ہے۔ ——— اور ناقابلِ تسخیر بھی۔

جوں جوں رات ڈھل رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کا نور گہرا ہو رہا تھا۔ آسمان سرمئی سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور ستارے ہوشربا حد تک تابناک ہوتے جا رہے تھے۔ کہکشاں کی روش ——— سب سے پرنور دکھائی دے رہی تھی۔

صاف لگ رہا تھا ابھی ابھی کوئی راہوں میں نور کی گولیاں پھینکتا سوتے فلک گیا ہے ——— اور آسمان پر ایک نوری روش بچھا گیا ہے۔

ایسے لگا جیسے وہ تصوف کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ اس نے زمین سے تا آسمان ہر شے کے بارے میں سوچا ——— نیند پھر بھی نہیں آئی ———

کچھ اندر سے پشیمان وہ بھی تھا۔ بڑے حوصلے سے ڈرائیور کو یہاں لے آیا تھا، مگر اب آگے کیا ہوگا؟ اگر صبح تک وہ کسی جنگل کے جانور کا شکار نہ ہو گئے.....

تو.....

آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے!

اس کے کانوں میں جیسے کوئی گنگنانے لگا۔

خیر ——— وہ جوان تھا اس لئے موت سے نہیں ڈرتا نہیں تھا۔ ہاں ——— مگر جان بوجھ کر خود کو موت کے حوالے کرنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ کیونکہ ابھی تو بے شمار کام تھے کرنے والے ———

امی کو اس کا سہرا دیکھنے کا ارمان تھا ——— اور ——— اسے کیتھی کا خیال آ گیا۔ کیتھی کے خیال کو اس نے جان بوجھ کر بلایا تھا۔ اصل میں اس وقت وہ سونا چاہتا تھا اور سونے سے پہلے جب تک خیال کوئی حسین سا منظر نہ بناتے، نیند نہیں آتی۔

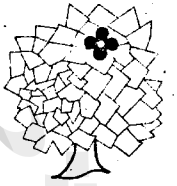

علی مرتضیٰ امریکہ سے جرنلزم کی ڈگری لے کر آیا تھا۔ یہاں آکر اُس نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک روزنامہ نکالا تھا۔ اس کے اندر کام کرنے کا جذبہ تھا۔ لگن تھی۔ جوش تھا۔ جنون تھا۔ اس کے سینے میں آگ لگی تھی۔ جس کی تپش سے وہ دنیا کو روشناس کرانا چاہتا تھا ـــــ وہ اس روبہ تنزل معاشرے میں کوئی اچھا کام کرنا چاہتا تھا ـــ کوئی عظیم کام کرکے مرنا چاہتا تھا۔ تب اس نے ایک اخبار نکالنے کا پروگرام بنالیا۔ اخبار کے لئے بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اسی خاطر اس نے تین سرمایہ دار دوستوں کا سہارا لیا۔ مستعد اور قابل عملہ رکھا۔ نئی تبدیلیوں کے ساتھ نئی امنگوں کے ساتھ ـــ اس کا روزنامہ "طلوع" منظر عام پہ آیا۔ وہ صحافت کو نئی قدروں سے آشنا کرنا چاہتا تھا۔ اور جو اخلاقی اقدار معاشرے میں پامال کی جارہی تھیں، ان کو سربلند کرنا چاہتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ عوام سے ہر قسم کا رابطہ رکھے ہوتے تھا۔ خصوصاً پسماندہ علاقوں اور لوگوں کی نقاب کشائی کرنا اس نے اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔

غریب عوام کہاں کہاں ہیں؟ اور کس کس حال میں ہیں ـــــ وہ دور دراز علاقوں کا سفر کرتا، لوگوں کے رہن سہن کا مشاہدہ کرتا۔ ان کے مسائل کی چھان بین کرتا اور پھر ان پر ایک باتصویر فیچر لکھ کر ہر مہینے اپنے اخبار کی نذر کرتا۔ چونکہ وہ خود جاکر صورت حال کا مشاہدہ کرتا تھا۔ اس لئے اس کا فیچر بہت اثر انگیز ہوتا۔

اس مرتبہ اس نے "چولستان" کی جانب رُخ کیا تھا۔ "چولستان" ایک ریگزار ہے۔ جو بہاولپور سے ساٹھ ستر میل پر ہے۔ وہاں بھی لوگ بستے ہیں جو ابھی تک شہری تمدنی سہولتوں سے محروم ہیں۔

علی مرتضیٰ نے بہت کچھ سُن رکھا تھا لیکن اس نے سوچا وہ خود چولستان کا دورہ کرے گا۔ وہاں کے باشندوں سے ملے گا۔ وہاں کی تہذیب کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کرے گا اور ایک باتصویر فیچر بنائے گا۔

بلکہ اس مرتبہ وہ اپنا مووی کیمرہ بھی ساتھ لے آیا تھا۔ وہ ٹی وی کے لئے ایک فلم بھی بنانا چاہتا تھا اس کی ٹیم کے کچھ اور لوگ بھی ساتھ آنا چاہتے تھے، لیکن اس نے سب کو منع کر دیا تھا اس کا خیال تھا پہلے وہ خود جاکر جائزہ لے گا۔ اس نے صرف ایک ڈرائیور اپنے ساتھ رکھا تھا۔ لمبے سفر میں ایک ہی آدمی کا کار چلانا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔

اور اب وہ لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ وہ طفیل کو ساتھ لے آیا تھا جبیہ
تو پہلے مرحلے پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ گو طفیل باتونی اور سٹریل تھا۔ مگر ڈرائیور بہت اچ
تھا۔ ـــــ اس نے کروٹ بدل کر طفیل کی طرف دیکھا ـــــ طفیل اس کھلے آسما
کے نیچے یوں سویا ہوا تھا۔ جیسے وہ ہر غم اور ہر فکر سے آزاد ہو چکا ہے۔

کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں یہ لوگ۔ علی مرتضیٰ نے سوچا۔ جن کی زندگی
مقصد کھانا پینا اور سونا ہے۔

جینے کے لئے جیتے جاتے ہیں۔

ایک وہ ہے کہ مقصد کے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔

جانے کب نرم نرم انگلیوں سے گدگدی کرتی ہوئی ۔۔۔۔ ریگستانی ہوا۔

اس پر مسمریزم کرنا شروع کر دیا۔۔۔۔ اور وہ سو گیا۔

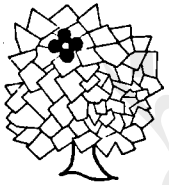

صبح کا کوئی پہر ہو گا،

شاید پو پھٹی ہو گی۔۔۔۔

ہوا کی چال بدل گئی تھی۔ رات وہ لڑکھڑا رہی تھی اور بہک رہی تھی۔

صبحدم نرم رو، آہستہ خرام بن گئی تھی، جیسے ایک شرمیلی دوشیزہ ہوتی ہے
ٹھنڈک بھی تھی اس میں اور مٹھاس بھی۔

کسی آواز نے علی مرتضیٰ کو جگا دیا تھا۔

کیسی آواز تھی ـــــ ؟ اُس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا، کوئی واضح
آواز نہیں تھی۔ آسمان کا رنگ اودا تھا ـــــ سورج نے بادلوں کی قبا نہیں پھاڑی
تھی ـــــ کس قدر صاف آسمان تھا۔ یہاں بادل بھی نہیں تھے۔ بادلوں کے بغیر
آسمان کتنا عجیب لگتا ہے ـــــ کسی کسی ستارے کے نشان آنسوؤں کی مانند کہیں

کہیں ٹکے تھے۔

طفیل ابھی تک بے سدھ سو رہا تھا۔

پھر اُسے کس آواز نے چونکایا تھا۔ شاید کوئی قریب سے گزرا تھا۔ اس نے رین کی طرف دیکھا ـــــ ریت پر تو کوئی نشان تھے۔ دُور دُور تک نشان ہی نشان ـــ شاید اُن میں چوپایوں کے قدموں کے نشان بھی تھے۔

لالٹینیں بنتی اور مٹتی آ رہی تھیں ـــــ دُور دُور سے آ رہی تھیں۔ دُور دُور تک جا رہی تھیں۔

تو ادھر سے قافلے بھی گزرتے ہیں ـــــ اور جانور بھی ـــــ

درخت کوئی نہیں تھا ـــــ سورج چڑھنے سے پہلے انہیں اپنا راستہ تلاش کر لینا چاہیے۔

صحراؤں کی رات جتنی ٹھنڈی ہوتی ہے، دوپہر اتنی ہی گرم ہوتی ہے۔ وہ جانتا تھا۔ مگر اس وقت بڑی سخت نیند آ رہی تھی۔ اور نسیم سحر بھی اتنی مدہوش کن تھی کہ اُس نے کروٹ بدل لی اور پلکیں موند لیں۔

پھر کوئی آواز آئی۔ اب اس نے آواز پر غور کیا ـــــ کوئی شے بجتی تھی۔ جیسے .... جیسے .... اُس نے دل میں سوچا جیسے کنگن بجتے ہیں ....

مگر کنگن یہاں کہاں ـــــ ؟ کوئی جانور ہوگا۔ یوں بھی سناٹا خواہ مخواہ بولتا رہتا ہے۔

وہ پھر سو گیا ـــــ

آواز پھر آئی ـــــ

اب کے اس نے سر اُٹھا کر جیپ کی طرف دیکھا۔ آواز جیپ کے پیچھے سے آتی تھی وہ سر اُٹھائے اُدھر دیکھتا رہا۔ انتظار کرتا رہا ـــــ تب جیپ کے نیچے پہیوں کے درمیان اسے دو پنڈلیاں نظر آئیں .....

پنڈلیاں اور یہاں ـــــ

"کون ہے بھئی" اس نے گلا صاف کر کے پوچھا۔

پنڈلیاں سمٹ گئیں۔

"کون ہے سامنے آؤ ـــــ"

پنڈلیاں چھپ گئیں ....

وہ خود کھڑا ہو گیا۔

ننگے پاؤں ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر چلتا .... جیپ کے پیچھے چلا گیا۔

ایک گھبراتی ہوئی لڑکی دوپٹے میں منہ چھپانا چاہ رہی تھی۔

علی مرتضیٰ نے دور کھڑے ہو کر پوچھا۔

"تم کون ہو یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اپنی بڑی بڑی سفید سفید آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"میں نے پوچھا ہے۔ تم کون ہو؟ کون ہو تم ——؟"
علی مرتضیٰ نے اپنا لہجہ شفیق بنا کر دوبارہ پوچھا۔
اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لمبی لمبی پلکوں کو جھپک جھپک کر علی مرتضیٰ کو یوں دیکھنے لگی جیسے عرصۂ دراز بعد اُس نے کسی انسان کی صورت دیکھی ہو؟
کمال ہے۔ علی مرتضیٰ نے اپنے دل میں سوچا۔ پتہ نہیں گونگی ہے یا بہری ہے۔
پھر یکایک اسے خیال آیا۔ شاید وہ اُردو زبان نہ سمجھتی ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس علاقے میں سرائیکی زبان بولی جاتی ہے۔ مگر وہ سرائیکی بول نہ سکتا تھا اگرچہ سمجھ سکتا تھا۔ کچھ عرصہ اسے ملتان میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یوں وہ کئی بار رحیم یار خاں بھی گیا تھا۔ ملتان اور رحیم یار خاں کی زبانیں سرائیکی سے قریب تر تھیں۔ اور اسے معلوم تھا، اس علاقے میں اِدھر اُدھر کم و بیش یہی زبان بولی جاتی ہے۔
اس نے سوچا پنجابی لب و لہجہ اختیار کرنا چاہیئے۔ شاید یہ سمجھ جائے ——
پھر اُس نے بڑی لجاجت سے مُسکرا کر کہا۔
"تم کون ہو اور یہاں کیسے آئی ہو ——؟"
وہ ذرا سا مُسکرائی اور اس نے ہرن کا بچہ آگے کر دیا۔ جواب تک بغل میں دبا ہوا تھا
علی مرتضیٰ نے ہرن کی طرف دیکھا۔ موٹی موٹی سُرمئی آنکھیں۔ نرم نرم بادامی جلد معصوم معصوم چہرہ ——
ہرن کا بچہ بھی جیسے . . . پلکیں جھپک جھپک کر ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

علی مرتضیٰ نے نظر ہٹا کر اُس لڑکی کی طرف دیکھا۔
بڑی عجیب بات ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ ہرن کی اور لڑکی کی آنکھوں میں کتنی مماثلت تھی۔ دونوں ایک ہی انداز میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ لڑکی کی آنکھوں میں ذرا سا خوف تھا۔ جبکہ ہرن کی آنکھوں میں التجا تھی۔
شاید یہی التجا ہر قیدی کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔
اُس نے ہرن کا بچہ ابھی تک آگے بڑھایا ہوا تھا۔
"کیا ہوا ہے اس کو ——؟" علی مرتضیٰ نے پوچھا۔
نقرئی ہنسی کے ساتھ اس نے بچہ پھر بغل میں دبا لیا۔ اور منہ پھیر کر ہنسنے لگی۔
اس کا مطلب ہے، وہ اس کی بات بخوبی سمجھ رہی تھی۔
"کیا تم میری زبان سمجھتی ہو؟" علی مرتضیٰ نے پوچھا۔
لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔
"پھر بولتی کیوں نہیں ہو ——" اس نے دانتوں میں سیاہ چادر کا کونہ دبا لیا ——
"کیا گونگی ہو ——" علی مرتضیٰ نے ساتھ گونگی کا اشارہ بھی کیا۔ اس پر دوبارہ اُس نے چاندی جیسا قہقہہ لگایا۔ اور بولی۔
"میں گونگی نہیں ہوں۔ میرا بیٹوں صبح صبح اس طرف بھاگ آیا تھا۔ میں اُس کے پیچھے دوڑتی دوڑتی اس طرف آ گئی تھی۔"

"پُنوں . . . کہاں ہے پُنوں ـــــ ؟" علی مرتضیٰ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا
اُس نے پھر اپنے ہونٹوں کے جلترنگ بجا دیئے۔
"میرے ہرن کا نام پنوں ہے سائیں ـــــ"
اُس نے پھر ہرن کا بچّہ اس کے آگے کر دیا۔
"مگر میں . . . میں سائیں تو نہیں ہوں . . . میرا نام علی مرتضیٰ ہے۔"
"علی سائیں ـــــ ؟"
"نہیں بھئی خالی علی . . . ."
اس پر لڑکی نے ایک اور قہقہہ لگایا۔
علی مرتضیٰ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اُس کے قہقہے جتنے نڈر اور بیباک تھے، اتنا ہی اُن میں زندگی تھی۔ اُمنگ سے بھرپور تھے۔ سچّے اور کھرے قہقہے۔ جس طرح بہت سے چاندی کے سکّے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر بج رہے ہوں۔ وہ ملک ملک پھرا تھا مگر اس نے ایسی کھنکتی ہوئی بے ریا اور مصفّا ہنسی کہیں نہیں سنی تھی۔
"اجنبی ہو ـــــ" اس نے پوچھا۔
"ہاں، راستہ بھول گیا ہوں۔"
"کہاں جانا چاہتے ہو ؟"
"میں قلعہ امرکوٹ میں جانا چاہتا ہوں۔"

"قلعہ امرکوٹ ـــــ" اُس نے حیران ہو کر پوچھا "یہاں کوئی قلعہ امرکوٹ نہیں ہے ـــــ . . . ہاں ایک جگہ ہے۔ جسے امروٹ کہتے ہیں ـــــ"
"امروٹ . . . امروٹ، ہاں ہاں وہی۔ مجھے اسی جگہ جانا ہے۔ لے چلو گی ؟"
"ہاں لے چلوں گی۔"
"کتنی دُور ہے ؟"
"یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے ـــــ"
"چلو پھر ـــــ" جب علی مرتضیٰ نے ننگے پاؤں قدم آگے بڑھائے۔ تو وہ بولی۔
"جیپ میں نہیں چلو گے سائیں ـــــ"
"نہیں میرا ڈرائیور سو رہا ہے ـــــ" آگے بڑھ کر اُس نے دیکھا، ڈرائیور واقعی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ جیسے وہ ریت پر نہیں کسی مخملیں بستر پر سو رہا ہو۔
"شاید جیپ کا ایک پہیہ بھی بیٹھ گیا ہے ـــــ اس میں کچھ اور خرابی بھی ہے۔ ڈرائیور اُٹھ کر اس کو ٹھیک کرے گا، یہ پھر چلے گی۔ میں پیدل چل سکتا ہوں۔"
"تو کیا ننگے پاؤں چلو گے۔"
"تم نے بھی تو جوتا نہیں پہنا ـــــ"
وہ پھر ہنسی۔
"ہمیں تو ننگے پاؤں پھرنے کی عادت ہے ـــــ"
"مجھے بھی یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت اچھی لگ رہی ہے۔"

"ابھی تھوڑی دیر بعد جب یہ ریت گرم ہو جائے گی تو آپ کے پا
پڑ جائیں گے۔"

"کیا ہم سورج اُبھرنے سے پہلے لَوٹ نہ آئیں گے؟"

"آپ احتیاطاً اپنے جوتے ساتھ لے لیں۔۔۔" لڑکی نے اپنا ہرن
بغل میں دبایا اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "یہاں سے میری جھوک قریب
پہلے وہاں چلیں۔ وہاں میرا بابا اور لالہ ہے۔ وہ آپ کو اپنے اونٹ پر بٹھا کر
گے اور جلدی یہاں چھوڑ بھی جائیں گے۔"

"تو کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو ——؟"

"نہیں!" اس نے سچائی سے سر ہلایا۔ "اس وقت مجھے بکریوں کا دودھ
ہے۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچی تو وہ شور مچا مچا کر سارا آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔"

"تو کیا کوئی اور نہیں ہے تمہارے گھر میں جو بکریوں کا دودھ نکال سکے؟"

"میری بہن ہے، ماں ہے —— میری بہن اذنٹنی کا دودھ نکالتی ہے
میری ماں گائے کا دودھ دوہتی ہے۔ بکریوں کو میری عادت ہے۔ کسی کو پاس
نہیں دیتیں۔"

"کتنی بکریاں ہیں تمہارے پاس؟" علی مرتضیٰ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے

"بس چار پانچ۔"

"بس۔۔۔۔ اور تم اتنا فکر کر رہی ہو۔ میرا خیال تھا تمہارے پاس بکریوں کا ایک

ریوڑ ہوگا۔"

"سائیں۔ ہم بہت غریب ہیں۔ اس علاقے میں کسی کے دو اُونٹ، ایک گائے
اور کچھ بکریاں ہونا ہی بہت بڑی بات ہے۔ ہم یہ دودھ فروخت کر کے اپنا گزارہ
کرتے ہیں۔"

"وہی غربت۔۔۔۔ وہی غربت۔۔۔" علی مرتضیٰ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر اپنے
ضبوط قدم رکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

جس جس پسماندہ علاقے میں وہ گیا، غربت نے اس کا خیر مقدم کیا۔۔۔۔ وہ صوبہ
سرحد کے پہاڑی علاقے ہوں یا پنجاب کے پسماندہ گاؤں —— بلوچستان کی خوبصورت
ادیاں ہوں یا سندھ کے ریگزار ——

غربت اور بیماری ہر جگہ کارفرما نظر آئی۔۔۔۔ ان کو کب روشنی ملے گی۔۔۔۔ ان
دہم کب زندگی عطا کریں گے ——؟

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ۔۔۔۔

بندے ہیں تیرے منتظر روزِ مکافات

وہ اپنے فیچر کے لئے عنوان سوچنے لگا۔

اسے اس وقت ہوش آیا جب وہ ایک گنبد نما عجیب سے گھر کے باہر کھڑا
تھا اور لڑکی اپنے پاؤں کی کڑیاں بجاتی ہوئی اندر بھاگ گئی تھی۔

اگلے ہی لمحے دو لمبے لمبے سانولے اور سرخ آدمی باہر نکل آئے۔

ایک معمر تھا، کیونکہ اس کے بال سفید تھے، دوسرا جوان تھا۔ لیکن دونوں کے چہروں پر ایک جیسی سختی اور کرختگی تھی۔ اعضا کھنچے ہوئے اور لوہے کی طرح سخت تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا، پیدا ہوتے ہی یہ جفاکشی کر رہے ہیں۔

انہوں نے پہلے تو علی مرتضیٰ کا اچھی طرح جائزہ لیا پھر آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔

علی مرتضیٰ نے انہیں اپنا نام بتایا اور یہاں آنے کی غرض و غایت بیان کی۔

اُن میں سے جوان آدمی نے علی مرتضیٰ کا ہاتھ تھام لیا اور بولا "میرا نام اللہ دتہ ہے۔ اور یہ میرا باپ ہے۔ اس کا نام ہے اللہ جوایا۔ یہ اس گاؤں کا نمبردار بھی ہے آپ اندر تشریف لائیں۔ آپ ہمارے دیس میں پہلی بار تشریف لاتے ہیں۔ مہمان کو ہم اپنی قسمت کہتے ہیں۔ ہم جب تک میزبانی کے فرائض انجام نہ دے لیں۔ آپ کو کہیں جانے نہ دیں گے۔ یہاں بیٹھ کر لسی پانی پئیں۔ پھر جو چاہیں گے، وہ ہو گا۔"

ان کی دعوت میں اتنا خلوص اور سادگی تھی کہ علی مرتضیٰ کا انکار کرنے کو دل نہیں چاہا۔

ذرا ذرا سے فاصلے پر دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ دروازے نسبتاً چھوٹے اور تنگ تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس گنبد کے اندر جائے۔ کیونکہ ایک گنبد میں باپ چلا گیا تھا اور دوسرے میں بیٹا ——

وہ باہر صحن کا جائزہ لینے لگا۔ صحن میں دو اونٹ بندھے ہوتے تھے۔ ان سے

پرے، ایک براؤن رنگ کی گائے کھڑی تھی —— دوسری طرف چار پانچ بھیڑ نما بکریاں ممیا رہی تھیں۔ انہی میں سے ایک بکری کی ٹانگوں میں سر دیئے، غالباً وہی لڑکی بیٹھی دُوہ رہی تھی۔ وہ اتنی مشاقی سے دودھ نکال رہی تھی کہ دھاریں نکلنے کی آواز علی مرتضیٰ کو صاف سنائی دے رہی تھی۔

اسی لمحے اللہ دسایا اپنے گنبد سے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے دو خواتین بھی تھیں۔ دونوں نے گھاگھرے پہن رکھے تھے۔ مگر منہ لپیٹے ہوئے تھے۔ غالباً انہوں نے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھی اٹھائی ہوئی تھیں۔

وہ ادھر سے نکل کر ساتھ والے گنبد میں چلی گئیں۔

تب اللہ دسایا نے علی مرتضیٰ کو اندر بلایا۔ علی مرتضیٰ کو اپنا سر خم کر کے دروازے میں سے گزرنا پڑا۔ حالانکہ یہ لوگ قدآور تھے مگر دروازے پھر بھی چھوٹے تھے۔

علی مرتضیٰ اندر چلا گیا۔ یہ گھر گاؤں کے عام گھروں سے مختلف تھا۔ لکڑیوں کا ڈھانچہ بنا کے اوپر ایک خاص قسم کی گھاس کا گول سا گنبد بنا ہوا تھا۔ گویا چھت گنبد نما تھی اور اس کو ہر طرف سے رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔

کمرہ اندر سے کافی کھلا اور ٹھنڈا تھا۔ مٹی کے فرش پر چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے۔ جن کے پائے موٹے موٹے اور منقش تھے۔ پلنگوں کے اوپر خوبصورت چارخانوں والے کھیس بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف رنگین شیشوں والے پیڑھے پڑے ہوئے تھے جو غالباً کرسیوں کا کام دیتے تھے۔

اللہ دسایا نے بیٹھنے کے لئے پیڑھوں کی طرف اشارہ کیا۔ مگر علی مرتضیٰ بے تکلفی سے پلنگ پر ہی بیٹھ گیا۔ جس پر اللہ دسایا مسکرا کر رہ گیا۔

جب اللہ دسایا باہر نکل گیا تو علی مرتضیٰ اِدھر اُدھر دیکھ کر ہر چیز کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے کے اندر وہی ماحول تھا۔ جو گاؤں کے ہر گھر میں ہوتا ہے ـــــ الگنی، کپڑے ٹنگانے کی کھونٹیاں، کارنس پر سجے ہوئے پرانے زمانے کے برتن ـــــ رنگین پراندے، رنگ برنگی صندوقچیاں ـــــ

اللہ دسایا دوبارہ اندر داخل ہوا۔ اب کے اس نے ہاتھ میں ایک بہت بڑا تانبے کا گلاس پکڑا ہوا تھا۔ یہ گلاس اُس نے علی مرتضیٰ کے آگے کر دیا۔ علی مرتضیٰ نے گلاس پکڑ لیا۔ گلاس اس قدر ٹھنڈا تھا جیسے ابھی ریفریجریٹر میں سے نکال کر لایا گیا ہو۔ اس کی ٹھنڈک محسوس کرتے ہوئے علی مرتضیٰ نے گلاس میں جھانکا۔ یقیناً اس میں لسی تھی۔ جس میں رس گلے کے برابر مکھن کا پیڑا تیر رہا تھا۔ وہ گاؤں کے آداب سے اچھی طرح واقف تھا۔ گاؤں میں مہمان کی تواضع اسی طرح کی جاتی ہے۔ گو اسے اس وقت گرم گرم چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ چائے کے بغیر تو وہ اپنی صبح کی ابتدا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لئے اس نے اپنا سفری سٹوو اور چائے کا سارا سامان جیپ میں رکھ لیا تھا، لیکن اس وقت اپنے میزبانوں کا دل رکھنے کے لئے اُسے یہ لسی پینا تھی۔ سو اس نے مسکرا کر گلاس اپنے منہ سے لگا لیا۔ بڑی ہی خوش ذائقہ اور میٹھی لسی تھی۔ بیچ بیچ میں رک کر وہ تھوڑا سا مکھن بھی کھا لیتا ـــــ اُسے معلوم تھا کہ مکھن

نہ کھانا بدتمیزی ہوگی۔ عجیب بات ہوئی۔ وہ لسی پی کر تازہ دم ہو گیا۔ جیسے رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا ہو۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ چائے کا ذائقہ بھول گیا۔

اللہ دسایا نے پوچھا ـــــ "کچھ اور کھانا پسند کریں گے آپ ـــــ؟"

"نہیں۔ شکریہ بہت بہت۔" علی مرتضیٰ کھڑا ہو گیا۔ "ڈرائیور مجھے وہاں نہ پا کر بہت پریشان ہوگا۔"

"تو پہلے ہم آپ کی جیپ کی طرف چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

دونوں باہر نکل آئے۔ اللہ دسایا نے اپنی زبان میں اپنے باپ سے کچھ کہا۔ اور پھر اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ علی مرتضیٰ نے کنکھیوں سے دیکھا۔ گھر کی عورتیں دروازے کی اوٹ سے اُسے تک رہی تھیں۔

اللہ دسایا آگے بڑھ کر دونوں اونٹ کھول لایا۔

اوچھ، اوچھ ..... کر کے پہلے اس نے ایک کو بٹھایا اور بولا۔ "یہ اونٹنی ہے۔ اور بڑی شریف طبیعت کی ہے۔ آپ اس پر بیٹھ جائیں ـــــ"

علی مرتضیٰ اس سے پہلے اونٹ پر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ ابھی پس و پیش میں تھا۔ اتنی دیر میں اللہ دسایا دوسرے اونٹ کو بٹھا کر اس پر بیٹھ گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی علی مرتضیٰ بھی دوڑ کر اونٹنی پر بیٹھ گیا۔ اللہ دسایا نے اُٹھ جانے کا اشارہ کیا تو کہ دونوں جانور ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔

بس انداز سے اونٹنی کھڑی ہوئی اس پر ذرا سی دیر کو علی مرتضیٰ کا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا اور نیچے کا نیچے، یہ پہلا اور انوکھا تجربہ تھا۔ اس نے ہر قسم کے جہازوں میں سفر کیا تھا۔ جمبو جیٹ میں بھی بیٹھا تھا۔ بحری جہازوں میں بھی سفر کیا تھا۔ مگر یہ تجربہ بالکل نیا تھا۔ پہلے چند سیکنڈوں میں تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اونٹنی اسے منہ کے بل گرا کے ایسی پٹخنی دے گی کہ دن میں تارے نظر آجائیں گے ـــــ مگر جب وہ ایک انوکھی شعبدہ گری کے تحت نیچے اوپر ڈولتی ہوئی ایک دم کھڑی ہو گئی تو علی مرتضیٰ کی جان میں جان آئی۔

دونوں جانور آگے پیچھے چلنے لگے۔

چند قدم چلنے پر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس جانور پر سواری کرنے کے لئے جسم اور اعصاب دونوں مضبوط ہونے چاہئیں ـــــ یہ تو اچھا خاصا بحر پیما دینے کو کافی تھا۔

لیکن لطف بھی آرہا تھا ـــــ آدمی بلندی پر بھی ہو اور سفر بھی کر رہا ہو۔ خوبصورت تجربہ ہے ـــــ اوپر بیٹھ کر اس نے دیکھا۔ ریت پر دور تک نشان ہی نشان تھے۔ قدموں کے نشان۔ چوپایوں کے نشان، قافلوں کے نشان ـــــ اور یہ دیکھ کر اُسے اور بھی تعجب ہوا کہ اللہ دسایا نے اُونٹ کو اسی راستے پر ڈال دیا تھا، جس راستے سے علی مرتضیٰ اور اُس کی بہن چل کر آتے تھے ـــــ وہ اپنے ہی نقشِ قدم کو ریت پر دیکھ کر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ اور دونوں جانوریوں بھاگے جا رہے تھے، جیسے اس سے اچھا کوئی اور مشغلہ نہ ہو ـــــ

واقعی اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ طفیل کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بستر لپیٹ

س نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ شاید اِدھر اُدھر گھوم پھر کر تھک چکا تھا۔ منہ اور سر پر
ت ہی ریت تھی ـــــ منہ لٹکائے ایک طرف بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ جونہی
ں نے اپنے سامنے دو اُونٹ آتے ہوئے دیکھے چونک گیا۔ اور جب اونٹ قریب
ر بیٹھے۔ . . . اور ایک پر اُس نے علی مرتضیٰ کو دیکھا تو ایک دم اُس میں جان
گئی ـــــ

"صاحب جی ـــــ صاحب جی ـــــ آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

مگر علی مرتضیٰ جواب دینے کے بجائے اپنے حواس درست کر رہا تھا، کیونکہ جب
ونٹنی بیٹھی تو علی مرتضیٰ پھر ایک نئے تجربے سے آشنا ہوا ـــــ جب اس نے اپنی پچھلی
انگیں زمین پر ٹکائیں تو اس نے سمجھا بس اب اسے پٹخنی مار کے گرایا جائیگا۔ مگر اپنی
انگیں بڑے قرینے سے تہہ کر کے اونٹنی واقعی بیٹھ گئی۔ تو اُس کی جان میں جان
ئی۔ کافی دیر تک وہ زمین پر پاؤں رکھنے کے قابل نہیں ہوا۔ جب طفیل نے اُس کا
ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا تو اسے احساس ہوا کہ اُسے نیچے بھی اُترنا ہے۔

"صاحب جی ـــــ صاحب جی ـــــ یہ آپ نے کیا کیا جی ـــــ آپ تھوڑی
دیر اور نہ آتے تو میں فوت ہو جاتا!"

علی مرتضیٰ کو ہنسی آگئی۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے جی ـــــ میں نے سمجھا آپ کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔"

"نہیں بھائی . . . ہم مہمانوں کو اغوا نہیں کرتے۔ بلکہ اُن کو اپنی جان سے زیادہ

عزیز رکھتے ہیں"۔ اللہ وسایا نے آگے بڑھ کر کہا۔

"تم اپنی شکل دیکھو، کیا حالت بنا رکھی ہے"۔ علی مرتضیٰ نے طفیل کے چہرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"او صاحب جی، میں تو گریبان پھاڑ کر دیوانوں کی طرح چلّانے والا تھا۔ اگر آپ دیر اور نظر نہ آتے تو یہاں آپ کو دیوانہ نظر آتا"۔

اس پر علی مرتضیٰ اور اللہ وسایا خوب ہنسے.....

"آپ ایسا کریں سائیں جیپ اسٹارٹ کر کے ہماری "جھوک" پر چلیں۔ نہا دھو کر ناشتہ کریں۔ اس کے بعد جو دل چاہے کریں۔ کیونکہ آپ کے ڈرائیور کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے"۔

علی مرتضیٰ نے جیپ کا بونٹ اٹھا دیا۔ اور طفیل سے کہا وہ پٹرول کا گیلن اٹھا لائے اُس نے اچھی طرح انجن چیک کیا۔ پٹرول ڈالا ——— جو پہیہ پنکچر ہو چکا تھا اُسے بدلا اور اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ اللہ کا نام لے کر جیپ اسٹارٹ کی، تو وہ اسٹارٹ ہو گئی۔ طفیل کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔ چھلانگ لگا کر جیپ میں بیٹھ گیا۔

علی مرتضیٰ نے اسے واپس دھکا دے دیا۔ پہلے اپنا سامان اٹھا کر پیچھے رکھو پھر اللہ وسایا کو آگے بیٹھنے دو۔ اور خود پیچھے بیٹھو"۔

چند منٹوں میں ہی وہ لوگ اللہ وسایا کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔

اس مرتبہ جیپ کی آواز سُن کر خواتین باہر نکل آئیں اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں

اللہ وسایا اور اس کا باپ مِل کر جیپ سے سامان اتارنے لگے ———

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ ؟" علی مرتضیٰ نے اس کے باپ کو ٹوکا۔ "میرا ڈرائیور سب سامان اُتار لے گا"۔

"سائیں آپ ہمارے مہمان ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ سامان اتارنے لگا۔

اُن کا سامان اسی گنبد نما کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سچی بات ہے۔ طفیل وہاں جا کر بہت مطمئن نظر آ رہا تھا ———

نہا دھو کر انہوں نے کپڑے بدلے۔ اتنے میں ناشتہ تیار کر آ گیا۔ گرم گرم پراٹھے ورد ہی ——— ساتھ اُبلے ہوئے انڈے بھی تھے۔ اور چائے بھی تھی۔ گو چائے کا ذائقہ شہری چائے سے مختلف تھا لیکن اس وقت گرم گرم چائے نے بڑا مزہ دیا۔

طفیل نے اتنا زیادہ کھا لیا کہ مزید سفر کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

علی مرتضیٰ باہر جا کر اللہ وسایا اور نمبردار اللہ جوایا کے پاس بیٹھ گیا۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بولا۔

"ممکن ہے مجھے یہاں ایک مہینہ رہنا پڑے۔ آپ مجھے کوئی مناسب جگہ بتا دیں جہاں میں قیام کر سکوں"۔

نمبردار مونچھوں کے اندر مسکرایا اور بولا۔

"علی سائیں! مناسب جگہ تو یہی ہے۔ جہاں ہم آپ کو لے آئے ہیں۔ مگر یہ جگہ آپ کے رہنے کے قابل ہے یا نہیں، یہ ہم نہیں جانتے"۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" علی مرتضیٰ نے جلدی سے کہا۔ ہم آپ کو تکا
نہیں دینا چاہتے۔"

"آپ جسے تکلیف کہتے ہیں، ہم اسے راحت کہتے ہیں۔ اس ریگستان
آتا ہے۔ کبھی کبھار کوئی شکاری یا سیاح آنکلتا ہے، اس کو اپنے گھر مہمان رک
پرانی روایات میں سے ہے۔ آپ میرے گھر سے چلے جائیں گے تو کوئی او
دروازہ کھول دے گا۔ یہاں شہروں کی طرح سرائے یا ہوٹل نہیں ہوتے۔ یہاں
کے مکین مہمان کے منتظر رہتے ہیں۔ اور مہمانوں کو اپنے ہاں ٹھہرانا خوش نصیبی
ہیں۔ اگر آپ انکار کریں گے تو میں سمجھوں گا کہ یہ گھر آپ کے قابل نہیں تھا
پھر میں کسی بڑے منبردار کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ جہاں آپ کو پورا پورا آرام مل

"نہیں محترم بزرگ! ایسی کوئی بات نہیں! میں آپ کی روایات کے بار
کچھ نہیں جانتا۔ مجھے چونکہ زیادہ وقت گھومنے پھرنے میں گزارنا ہے۔ اس لئے
تھا، یہاں کے کسی پرانے قلعے میں مجھے رہائش کی اجازت مل جائے تو زیادہ
میرا خیال ہے۔ قلعے میں رہنے سے بہتر ہے، آپ ہمارے گھر میں رہ
یہاں ہم لوگ ہر قسم کی معاونت کو ہر وقت تیار رہوں گے۔ اگر خدانخواستہ
ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے جیسی کل رات پیش آئی تھی تو ـــــ کیونکہ صحرا میں
بھول جانا سب سے بڑا المیہ ہے۔"

"صاحب جی .... صاحب جی ـــــ" جانے کس وقت طفیل ان

پاس آکھڑا ہوا تھا۔ جلدی سے بولا۔

"یہیں رہ جاتے ہیں۔ یہیں ـــــ ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔"

اُس کی بات سُن کر سب ہنس پڑے۔

علی مرتضیٰ نے سب کی طرف دیکھا ـــــ گھر کے سب مکین اس کے ارد گرد
کھڑے تھے اور سب کے چہروں پر خلوص ہی خلوص سچائی ہی سچائی تھی ـــــ بلکہ ایک
التجا بھی تھی ـــــ جب علی مرتضیٰ کی نظر اُس ہرن والی لڑکی پر ٹکی، تو اُس نے
فیصلہ کر لیا، وہ یہیں رہے گا۔

اُس کا فیصلہ سُن کر سب خوش ہو گئے۔ طفیل تو کمرے کے اندر جا کر اپنا سامان
بھی کھولنے لگا۔

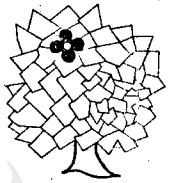

ایک ہفتہ ہوگیا تھا علی مرتضیٰ کو اس علاقے میں آئے ہوئے۔ اب تو ڈرائیور طفیل بھی ان صحرائی علاقوں سے مانوس ہوگیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اللہ دسایا اچھا گائیڈ تھا۔ ہر روز صبح ناشتے کے بعد وہ اُن کے ساتھ بیٹھ کر دور دراز کے علاقے میں جا اور ریگستان کے بارے میں ہر قسم کی معلومات فراہم کرتا۔

ایک روز جب علی مرتضیٰ اپنی "جھوک" میں بیٹھا اپنے لمبے لمبے چمڑے کے بوٹ پہن رہا تھا اور طفیل دور ندی کے کنارے جیپ دھو رہا تھا۔ تو ایک دم بہت سے زیور بج اٹھے۔

علی مرتضیٰ نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ دروازے میں دیہی ہرن والی لڑکی کھڑی تھی وہ تنگ سے دروازے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ باہر سے اس کی پشت پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ اندر کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا —— روشنی باریک کرتی کے اندر سے اس کے اعضا کو چیر کر کمرے کے اندر آرہی تھی۔ ذرا سی دیر کو علی مرتضیٰ مبہوت سا بنا اس لڑکی کو دیکھتا رہا —— یوں معلوم ہوا کسی نے ایک حقیقی عورت کا مجسمہ تراش کر دروازے میں کھڑا کر دیا ہے۔ ٹخنوں سے اونچا گھاگھرا —— گھاگرے کے نیچے پاؤں میں بیشما

چاندی کے زیور —— چاندی کے زیور تو اُس کے سارے چہرے پر بھی جگمگا رہے تھے

علی مرتضیٰ نے جلدی سے اپنی نظریں ہٹالیں اور بولا —— "اندر آجاؤ"

اُجالے اندھیرے کے سنگھم پر اس کا کھڑے رہنا علی مرتضیٰ کے حق میں ٹھیک نہیں تھا۔

لڑکی جھن جھن کرتی اندر آگئی۔ اور فرش پر بیٹھ گئی۔

"تمہارا نام کیا ہے ——؟" جلدی سے علی مرتضیٰ نے پوچھا۔ جیسے اپنے اندر اٹھنے والے طوفان سے خود کو بچانا چاہتا ہو، حالانکہ اُس نے گھر میں کئی بار اس کا نام سنا تھا۔ وہ کئی بار اُن کے کمرے میں روٹی یا کوئی چیز دینے آئی تھی۔ اب گھر کے مکین انہیں اجنبی نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ سب مانوس ہوگئے تھے۔

"میرا نام سکھو ہے سائیں ——!" اُس نے ہنس کر کہا۔ اُس کے سفید سفید دانت موتیوں کی طرح دمکنے لگے۔

"سکھو۔ سکھو بھی کوئی نام ہوتا ہے"۔ وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔

"میرا نام غلام سکینہ ہے سائیں۔ مگر سب مجھے پیار سے سکھو بلاتے ہیں"۔

"اچھا.... اچھا.... مگر تم لوگ اچھے خاصے نام کی ریڑھ مار کے رکھ دیتے ہو"

وہ ہنسنے لگی۔ گھونگھرو بجنے لگے۔

ہمارے یہاں رواج ہے سائیں۔ میری بڑی بہن کا نام غلام زینب ہے مگر ہم اُسے زینو کہتے ہیں۔ اور میری ماں کا نام غلام عائشہ ہے۔ سب اسے

آستاں ماتی کہتے ہیں ـــــ اور۔"

"اچھا سنو۔ تمہارے بابا کہاں ہیں؟" علی مرتضیٰ نے اُسے جلدی سے ٹوک دیا کہ کہیں وہ سارے خاندان کے ناموں کی فہرست نہ سنانے بیٹھ جائے۔

"میرا بابا برات سے میری بڑی (پھوپھی) کے ہاں گیا ہے۔ اُس کی طبیعت خرا ہے۔ اور ایک آدمی بُلانے آیا تھا اور لالہ شہر گیا ہے۔ کچھ سودا وغیرہ لانا تھا۔"

"اچھا تبھی میں سوچ رہا تھا۔ صبح سے کوئی ہمارے ساتھ جانے والا نہیں آیا" وہ پھر ہنسنے لگی۔

یہ کام تو بابا میرے ذمے لگا گیا ہے۔"

"کیا ـــــ؟"

"ہاں ـــــ" اُس نے اپنی بڑی بڑی غزالی آنکھیں کھول کر کہا۔ "بابا نے تھا۔ آج آپ لوگوں کے ساتھ میں جاؤں۔"

"تم ـــــ یعنی تم ـــــ" علی مرتضیٰ نے بے یقینی سے کہا۔

"جی . . . میں ـــــ" وہ فخر سے بولی۔ "میں اس سارے علاقے کی مہارا ہوں۔ کہاں جانا چاہتے ہیں آپ ـــــ اگر میں ساتھ میں ہوں گی تو آپ با راستہ نہیں بھولیں گے۔"

"اچھا . . ." علی مرتضیٰ نے سر جھکا لیا۔ اور سوچنے لگا۔ اس لڑکی کے سا جانا چاہیئے یا نہیں۔

"میں نے آپ کے لئے کھانا پکا لیا ہے سائیں" وہ بولی" اور میں اپنی اونٹنی "صاحباں" پر جاؤں گی۔ آپ کی پھٹ پھٹ میں نہیں جاؤں گی۔ ایک بار میں لے کے ساتھ اس میں بیٹھی تھی۔ میرا جوڑ جوڑ ٹوٹ گیا تھا۔"

واہ ـــــ علی دل میں ہنسا ـــــ اونٹ پر سواری کرنے والی لڑکی اتنی نازک کیسے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ علی کا جوڑ جوڑ تو اونٹ ہلا دیتے تھے۔

"سائیں کب جاؤ گے ـــــ؟" اُس نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بس میں تو تیار ہوں" علی کھڑا ہو گیا۔

وہ باہر بھاگ گئی "میں کھانا باندھ لوں ـــــ"

کھانا باندھ کر اُس نے اونٹنی کی مہار پکڑی اور علی کے ساتھ اس طرف جانے لگی۔ جہاں طفیل جیپ دھو رہا تھا۔

طفیل نے ان دونوں کو آتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ آج دُور دراز کا پروگرام ہے اور مروتاً اسے بھی اونٹ پر بیٹھنا پڑے گا۔ اس لئے جلدی سے بولا۔

"آج جیپ نہ چل سکے گی صاحب! ابھی بہت کام ہے۔"

"کیا تم نہیں جاؤ گے طفیل ـــــ؟"

"آج مجھے نہیں لے جاؤ صاحب ـــــ میں بہت تھکا ہوا ہوں ـــــ"

سکھو نے اشارے سے اُونٹنی کو بٹھایا اور لپک کر آگے بیٹھ گئی۔

"آجاؤ سائیں کیا سوچ رہے ہو ـــــ؟"

علی نے اپنا مووی کیمرہ سنبھالا۔ فلیش گن کو ہاتھ میں لیا اور فائل کو تھیلے میں رکھا اور لپک کر سکھو کے پیچھے بیٹھ گیا۔

اونٹنی کھڑی ہوئی اور چل پڑی۔

"عجیب بات ہے، علی نے سوچا، سکھو کے ساتھ بیٹھ کر اسے اونٹنی سے ذرا بھی ڈر نہیں لگا تھا۔ بلکہ اس کا اٹھنا بھی اس کی ایک ادا لگا تھا۔

جب وہ اپنے گھونگھرو بجاتی بھاگی، تو سکھو کے معطر بال علی کے چہرے پر بکھرنے لگے۔۔۔ کیسی مہک آ رہی تھی۔ ان بالوں سے ــــ کچے دودھ کی، .... شہد کی ــــ بہت سی مہکتی زلفیں اس نے سونگھی تھیں۔ ملک ملک کے گیسو دیکھے تھے ــــ ان گیسوؤں کی کوئی اپنی ہی خوشبو تھی۔

"تمہیں پتہ ہے سکھو! پہلے دن جب میں اونٹنی پر بیٹھا تو میرا کیا حشر ہوا ــــ؟" اپنے خیالات کی یلغار سے بچنے کے لئے اس نے باتیں کرنا شروع کر دیں۔

"کیا ہوا تھا سائیں ــــ؟"

علی نے اسے پورا تجربہ سنایا۔ اور آخر میں کہا "میں نے سوچا تھا۔ جب شہر جاؤں گا۔ تو میرے اگلے دانت ٹوٹے ہوئے ہوں گے ــــ"

اس پر سکھو نے اس قدر خوبصورت قہقہے لگائے کہ علی کا دل دھڑکنے لگا۔ ایسے لگتا تھا، اونٹنی بھی سکھو کے قہقہوں کی تال پر رقص کر رہی ہے۔

"اچھا تو تمہاری اونٹنی کا نام 'صاحباں' ہے؟" اس نے پھر گفتگو شروع کی۔

"ہاں سائیں ــــ؟"

"تمہارے ہرن کا نام پنوں ہے ــــ؟"

"جی سائیں ــــ"

"اور گائے کا نام کیا ہے؟"

وہ پھر گھونگھرو بجانے لگی۔

"گائے کا نام سوہنی ہے"

"واقعی ــــ؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں سائیں ــــ"

"کیا سب گھروں میں ایسا ہوتا ہے ــــ؟"

"نہیں سائیں۔ جو لوگ جانوروں سے محبت کرتے ہیں، اور انہیں شروع سے بچوں کی طرح پالتے ہیں وہ ان کی پہچان کے لئے نام رکھ چھوڑتے ہیں"

"اور نام بھی بڑے رومانٹک رکھتے ہو ــــ"

"جی سائیں ــــ؟" اس کی سمجھ میں علی کی بات نہ آئی۔

"میں نے کہا تم لوگ خوبصورت نام رکھتے ہو!"

"بس جی جو نام علاقے میں مشہور ہوتے ہیں انہی میں سے کوئی رکھ لیتے ہیں"

"اچھا تم مجھے کہاں لئے جا رہی ہو ــــ؟"

"جہاں آپ کہیں گے وہیں لے جاؤں گی سائیں ــــ"

"یہ تم مجھے سائیں کیوں کہتی ہو ——— میں کوئی درویش ہوں؟"

"نہیں سائیں" وہ پھر اٹھلا کر ہنس پڑی۔ "ہمارے یہاں ادب سے بلانے کا یہی انداز ہے ———"

"تم مجھے علی کہا کرو۔"

"خالی علی نہیں کہہ سکتی۔"

"تو پھر علی صاحب کہو ———"

"ہاں، علی صاحب کو ہی ہم علی سائیں کہتے ہیں ——— کیا آپ کو علی سائیں کہلوانا اچھا نہیں لگتا؟" اُس نے گردن موڑ کر جب علی کے چہرے پر اپنی تیز و تند نگاہیں گاڑ دیں، تو علی کو یوں محسوس ہوا ——— قیامت اُس کے چہرے سے دو چار انچ پرے ہی رُک گئی ہے ——— جلدی سے بولا۔

"نہیں مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ تم مجھے علی سائیں ہی بلایا کرو۔"

"اچھا اب بتاؤ تم کہاں جانا چاہتے ہو ———؟"

"آج تم مجھے اس صحرا کی سیر کراؤ۔ جو آبادیوں سے دُور ہے۔ اور میدانی علاقہ ہے۔"

"ٹھیک ہے ———" یہ کہہ کر اس نے پھر اشارہ کیا۔ اونٹنی اپنی لمبی گردن اٹھا یوں بھاگی جیسے سامنے اُسے کہیں پانی نظر آ گیا ہو۔

اونٹنی بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اور صحرا کے مناظر فلم کی طرح اُن کے آگے

کتے جا رہے تھے ——— اونچے اونچے بھوری ریت کے ٹیلے تھے۔ کہیں کہیں دیاں بھی نظروں کے آگے سے گزر جاتی تھیں۔

تب وہ سکھو سے کوئی سوال کر لیتا۔

"یہ یہاں گنبد نما لکڑیوں کے گھر کیوں بنے ہوتے ہیں سکھو؟"

"علی سائیں، یہ غریب لوگ ہیں پکے گھر نہیں بنوا سکتے۔ یہ جو گھر ہے ناگول گول سے ہم "گوپا" کہتے ہیں۔ کسی علاقے میں "یہ جھوک" ہوتا ہے اور کسی میں "گویا" ان ایک خاص جھاڑی ہوتی ہے۔ جسے ہم "چگ" کہتے ہیں۔ یہ گوپے اسی چگ کی جھاڑی سے بناتے جاتے ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم صحرا میں کس قدر آندھیاں اور طوفان آتے ہیں، بگولے اڑتے ہیں تو ساتھ انسانوں کو لپیٹ کر لے جاتے ہیں۔ جھکڑ اُٹھتے ہیں گھروں کو اڑا کر لے جاتے ہیں۔ اس طرح ان گھروں کو ہم موٹے رسّوں سے باندھ دیتے ہیں تاکہ اڑ نہ سکیں۔"

"اچھا ———" علی نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے۔ تم لوگ خطرناک جگہوں میں رہتے ہو۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی خطرہ سر پہ منڈلاتا رہتا ہے۔"

"کیا شہروں میں خطرہ نہیں ہوتا علی سائیں ———؟"

"نہیں بالکل نہیں ———"

"کوڑ کوڑ ———" وہ مچل کر بولی۔

"یہ "کوڑ" کیا ہوتا ہے ———؟"

ہم جھوٹ کو کوڑ کہتے ہیں۔ جیسے ابھی تم جھوٹ بول رہے ہو۔ شہر میں انسان
کی اپنی بنائی ہوئی آفتیں ہیں۔ یہاں تو ہم صرف قدرتی آفتوں کا مقابلہ کرتے ہ
"بھئی انسان کی بنائی ہوئی آفتیں کیا ہوتی ہیں؟"
"دیکھو نا؟ کبھی تو وہاں بس موٹر سے ٹکرا جاتی ہے، کبھی ریل پٹڑی سے اُتر
جاتی ہے۔ اور سینکڑوں آدمی موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ کبھی پٹرول کی ٹنکی
پھٹ جاتی ہے۔ یا گیس کا چولہا پھٹ جاتا ہے ـــــ کبھی بارود کے کارخا
میں دھماکہ ہوتا ہے تو کئی بے گناہ موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں ـــ اور . . .
اور . . . جنگ بھی تو شہروں ہوتی ہے . . . "
"ارے ـــــ تمہیں اتنی باتیں کس نے بتائی ہیں"
"سائیں کیا ہم ریڈیو نہیں سنتے، اخبار نہیں پڑھتے"
"اچھا تو تم اخبار پڑھ لیتی ہو"
"نہیں میں تو نہیں پڑھ سکتی۔ میرا لالہ جب شہر جاتا ہے۔ ڈھیر سارے اخبا
آتا ہے۔ پھر ہمیں پڑھ کر سناتا رہتا ہے"
"میں جب یہاں سے جاؤں گا نا، تو تم لوگوں کے بارے میں اخباروں میں
کچھ لکھوں گا۔ تم اپنے لالے سے کہنا۔ تمہیں پڑھ کر سناتے گا۔
"نہیں۔ سائیں مجھے معلوم ہے۔ تم یہاں سے جاکر ہم لوگوں کو بھول جاؤ
ہر آدمی جو یہاں آتا ہے۔ یہی کہتا ہے۔ مگر جب یہاں سے جاتا ہے تو ہمیں

بھول جاتا ہے ـــــ لوگ صرف ہماری غربت دیکھنے آتے ہیں ـــــ"
"ارے نہیں . . . نہیں . . . اچھا وہ دیکھو ـــــ وہ سامنے جوہڑ کیسا
ہے۔؟" علی نے فوراً اُس کی بات بدل دی۔
"تمہاری صاحباں ادھر جانا چاہتی ہے ـــــ"
"وہاں پانی ہے ـــــ"
"پانی کیسے ہو سکتا ہے ـــــ؟"
"آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں"
"یہ جو علاقہ ہے نا؟ اس میں بڑے بڑے ٹیلے ہیں۔ اور ہر ٹیلے کے دامن
میں ایک جوہڑ ہوتا ہے ـــــ جسے ہم "ٹوبا" کہتے ہیں۔ "ٹوبا" ہماری زندگی کی
آخری اُمید ہوتا ہے"
"وہ کیسے ـــــ؟" علی نے قلم اور فائل سنبھالنا چاہا۔ مگر اُس نے کہا ہم کسی
جگہ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اتنے میں ہماری اونٹنی پانی بھی پی لے گی۔ ایک
ٹوبے کی آغوش میں اس نے اونٹنی کو بٹھا دیا۔ اور دونوں اُتر گئے۔
اونٹنی اٹھ کر ادھر کو چلی، جدھر پانی تھا ـــــ علی نے اپنا کیمرہ سنبھالا ـــــ
اور فوکس کرنے لگا ـــــ کافی تصویریں لینے کے بعد اُس نے کیمرہ بغل میں دبا
لیا۔ اور اپنی فائل نکال لی۔
"آؤ میں تمہیں پانی دکھاؤں ـــــ"

سکھوا سے لے کر "ٹوبے" کے قریب گئی۔۔۔۔ "دیکھو یہاں پانی جمع ہے"

"ہاں"

"یہی پانی ہماری زندگی ہے"

"آپ شہری لوگ تو پانی کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوں گے کیونکہ آپ کے پاس بے حساب پانی ہوتا ہے۔ مگر ہمارے پاس پانی نہیں ہوتا۔ ہم آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ برسات کا موسم ہمارے لئے زندگی کا مژدہ لاتا ہے۔ ہمارے خود ساختہ ندیاں اور کنویں بارش کے پانی سے بھر جاتے ہیں۔ انہی سے ہم اپنی کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔ اپنے مویشیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ اور ضروریات پوری کرتے ہیں۔۔۔۔ نشیب کے ان میدانی علاقوں میں، ان "ٹوبوں" میں بارش کا پانی اکٹھا ہوتا رہتا ہے اور جب برسات کا موسم نہیں ہوتا۔ اور پانی ختم ہو جاتا ہے تو ہم ان "ٹوبوں" والے علاقوں میں چلے آتے ہیں"

علی کے لئے یہ انکشافات کافی روح فرسا تھے۔ اس نے سگریٹ سلگا اور فائل میں کچھ لکھنے لگا۔

"کیا کبھی ایسا بھی ہوا۔۔۔۔ کہ کوئی جانور یا آدمی پیاس سے مر گیا ہو۔ اور اُسے پانی نہ ملا ہو۔۔۔۔"

"کبھی۔۔۔۔؟" سکھوا افسردگی سے مسکرائی۔ "اکثر ایسا ہوا ہے۔۔۔۔"

"صحرا میں دو طریقوں سے غیر قدرتی موت واقع ہوتی ہے۔ ایک تو جب

راستہ بھول جائے، وہ انسان ہو یا جانور، پاگل ہو کر مر جاتا ہے۔۔۔۔ اور دوسرے جب ان کے پاس پانی نہ ہو۔ اور وہ سفر میں ہو تو تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔۔۔۔"

علی کو ایک دم جھرجھری آ گئی۔ ہم پانی کو کتنی حقیر شے سمجھتے ہیں۔ فضول ضائع کرتے ہیں۔ اور یہاں کئی انسان ایک گھونٹ پانی کے لئے دم توڑ دیتے ہیں۔

سو تیری اتنی بڑی دنیا ہے مالک! اور تیری قدرت کے نرالے ڈھنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ علی کا دل بجھنے لگا۔۔۔۔ اپنا موڈ ٹھیک کرنے کو بولا۔۔۔۔

"تجھے پتہ ہے سکھو! ہم راستہ بھول گئے تھے۔ اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔۔۔۔ اگر تو اس روز نہ آتی تو۔۔۔۔"

"علی سائیں۔۔۔۔" سکھوا ایک دم چیخ اُٹھی۔ "ایسا نہ کہو ہم مسافروں کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں"

"لیکن فرض کرو ہمیں راستہ نہ ملتا تو۔۔۔۔؟"

"اللہ کا شکر کرو کہ اس روز بارش نہیں ہوئی"

"کیوں۔۔۔۔؟"

"بارش ہو جائے تو راستوں کے سارے نشان مٹ جاتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم نہ ہو گا۔ صحرا میں لوگ قدموں کے نشانات پر سفر کرتے ہیں۔ ریت کے اوپر کئی کئی روز تک قافلوں کے نشانات رہتے ہیں۔ اس سے ہم راستے متعین کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر بارش ہو جائے تو پھر سارے راستے مٹ جاتے ہیں"

"تو اس کا مطلب ہے مجھے تمہارا شکر گزار ہونا چاہیئے۔"

"میرا نہیں میرے پیسوں کا۔" سکھو نے ہنس کر کہا۔

"اے، تمہارا پیسوں کہاں ہے؟"

"سائیں، ایک کا ساتھ دیا جا سکتا ہے نا؟ پیسوں کو گھر میں چھوڑ آئی ہوں۔"

"چلو کہیں بیٹھتے ہیں۔ اور کچھ کھاتے ہیں۔ بھوک لگ رہی ہے۔"

سکھو نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اونٹنی پانی پی چکی تھی۔ اور اِدھر اُدھر جھاڑیوں پر منہ مار رہی تھی۔ "اس جھاڑی کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔"

سکھو نے دور ایک جھاڑی کی طرف اشارہ کیا ـــــ اور کھانے کی گٹھڑی اٹھا کر اُدھر کو چل دی۔

ایک جھاڑی کے پاس جا کر وہ رک گئی۔ ریت پر اپنی "نکار" (چادر) بچھائی اور کھانا کھولنے لگی۔ علی نے چاروں طرف دیکھا اور پھر وہ چادر پر بیٹھ گیا۔ بہت ہی پیاری پیاری خوشبو آ رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنی فلاسک میں سے چائے نکالی اور پینے لگا ـــــ

"تم پیو گی ـــــ؟"

"پی لوں گی۔" اُس نے مسکرا کر کہا۔

علی نے پلاسٹک کے کپ میں چائے انڈیل کر سکھو کو دی۔ چائے پیتے پیتے اس نے جھاڑی کا ایک پتہ توڑ لیا۔ اُسے مسل کر ناک کے قریب لے گیا۔ تو حیرت سے

چھل پڑا۔

"سکھو! اس جھاڑی میں سے تو بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔"

"علی سائیں! اسے ہم "قطرن" کہتے ہیں ـــــ"

"قطرن ـــــ؟"

"ہاں قطرن ایک خوشبودار جھاڑی ہوتی ہے۔ اس کے دو فائدے ہیں ـــــ"

"کیا کیا بھئی ـــــ"

"اگر گائے یہ جھاڑی کھالے تو اُس کے دُودھ میں سے خوشبو آنے لگتی ہے۔"

"اچھا ـــــ؟" وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔

"اور اُس کا عرق کشید کر کے دمے کے پُرانے مریض کو پلائیں تو وہ ایک دم اچھا ہو جاتا ہے۔"

"واقعی یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔ اسے توڑ کر میں شہر کیوں نہ لے جاؤں ـــ"

"یہ شہر میں مُرجھا جائے گی سائیں ـــــ"

"کیوں ـــــ؟"

"جنگل کے پھول شہر میں نہیں کھلتے سائیں ـــــ"

علی نے مڑ کر سکھو کے چہرے کو حیرت سے دیکھا۔ اس کا سنہری چہرہ بالکل سُرخ ہو گیا تھا۔ نوکیلے نقوش چاند تاروں کی طرح چمک رہے تھے . . . اس کے چہرے پر ایک سوز تھا۔ ایک آگ تھی۔ ایک تڑپ تھی۔

یہ تانبے ایسا، کندن کندن چہرہ ـــــ صحرا کی ایک انوکھی تخلیق تھا۔

علی مرتضیٰ نے پہلی مرتبہ سوچا کہ صحرا نشین اس قدر خوبصورت ہوتے ہیں۔ اُس نے کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے بالے پہن رکھے تھے ـــــ ماتھے پر جھالر نما چھگن تھا۔ ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں تھیں۔ اور انگلیوں میں بے شمار گھونگھروؤں والے چھلے تھے ـــــ گلے میں چاندی کی موٹی سی ہنسلی پہنی ہوئی تھی۔ اسکی نازک سی گردن کے پاس پہنچ کر علی مرتضیٰ رک گیا ـــــ بلوریں شفاف گردن، جیسے شیشے کی بنی ہو۔ اس نازک گردن نے ہنسلی کا بوجھ جانے کیسے اٹھایا ہوا تھا۔۔۔ اس کا دل چاہا۔ وہ اپنے ہاتھ سے اس گردن کو ہنسلی سے آزاد کردے ـــــ لیکن کیا وہ اس گردن کو چھو سکے گا۔؟

سکھو نے سر جھکایا ہوا تھا ـــــ اس کی دودھیا مانگ بالوں کے درمیان چمک رہی تھی اور ناک میں سونے کا بڑا سا "پوپا" چمک رہا تھا ـــــ باریک سی نوکدار ناک کو اُس نے زیوروں کے عذاب میں گرفتار کیا ہوا تھا ـــــ بائیں طرف ناک کے بالی ہی رنگین "پوپا" تھا ـــــ تو ناک کے نچلے حصے میں "بولا" لٹک رہا تھا۔ ("بولا" ایک بالی ہوتی ہے، جو صحرائی لوگ ناک کے نتھنوں کے درمیان لٹکاتے ہیں)

وہ زیوروں کے بغیر بھی قدرت کا شاہکار تھی۔

علی مرتضیٰ خوف زدہ ہو کر کھڑا ہو گیا ـــــ سارے صحرا کی جیسے آنکھیں لگ گئیں۔۔۔ اور اس کے دل کا چور دھک دھک بولنے لگا۔

"چلو تمہاری کچھ تصویریں بناتے ہیں ـــــ"

سکھو بھی چونک کر کھڑی ہو گئی ـــــ علی نے مختلف زاویوں سے سکھو کی متعدد تصویریں بنائیں۔ اپنے مووی کیمرے کو۔۔۔ اِدھر اُدھر اچھی طرح گھمایا ـــــ اور پھر اونٹنی پر سوار ہو کر چل دیئے۔ اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ گو یہ مارچ کا مہینہ تھا۔ اور وہ موسم بہار کا سہارا لے کر یہاں چلا آیا تھا۔ مگر سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ اور ایسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کی جلد پھٹ جائے گی ـــــ چونکہ سکھو بالکل بے پرواہ تھی۔ اس لئے وہ گرمی کا نام نہ لیتا تھا۔

"اب کس طرف چلیں سائیں ـــــ؟" سکھو نے اونٹنی کو ٹانگ مار کر پوچھا۔

"ابھی دو گھنٹے ہم اور سفر کر سکتے ہیں۔ اس لئے مجھے یہ میدانی صحرا دکھا دو ـــــ تمہیں پتہ ہے نا چار بجے ہم واپسی کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ تاکہ وقت پر گھر پہنچ سکیں۔"

"ٹھیک ہے ـــــ"

"اونٹنی پھر ایک طرف کو بھاگنے لگی۔

"کیا تم صحرا کے لوگ آپس میں ملتے جلتے ہو؟" علی نے پوچھا۔

"ہمارے قبیلے ہوتے ہیں سائیں۔۔۔ ایک قبیلے والے دوسرے قبیلے سے ضرور ملتے ہیں۔ اور آپس میں شادیاں بھی۔۔۔ کرتے ہیں۔"

"تمہارے ہاں قانون کیا چلتا ہے؟"

"ہمارے ہاں قبیلے کا قانون چلتا ہے۔ قبیلے کا نمبردار سردار ہوتا ہے! اور سب

اُس کے فیصلے کے آگے سر جھکاتے ہیں۔"

"تمہارا بابا بھی تو مغرور ہے۔ اس کا مطلب ہے تمہارے قبیلے میں تمہارا قانون چلتا ہے ——"

"نہیں سائیں ——" وہ زور سے ہنس پڑی۔ "ہمارے ہاں عورت کی حکمرانی نہیں مانی جاتی۔ عورت تو بیچاری عورت ہوتی ہے ——"

(بہت پتے کی بات کہی ہے تو نے۔ علی نے دِل میں سوچا۔ عورت ہر ملک جگہ صرف عورت ہوتی ہے)

"دیکھو سکھو، تیری بات تو لوگ یونہی مان جاتے ہوں گے۔"

"کیا مطلب —— علی سائیں ——"

بھئی تو جو اتنی خوبصورت ہے۔ قیامت ہے۔ بلا ہے —— تو تیرے ایک اشارے پر لوگ اپنا سر کٹا دیتے ہوں گے؟"

سکھو خوش نہیں ہوئی۔ بلکہ اُس نے حیرت سے علی کو دیکھا اور پھر اپنا سر جھ

"یہ سامنے پڑاؤ کیسے ہیں ——؟" علی نے دریافت کیا۔

"یہ لوگوں کے گھر ہیں۔ ہر پڑاؤ میں دو گوپے بنے ہوتے ہیں۔ یہاں لوگ رہتے ہیں۔ اس طرح صحرا میں سفر کی سہولت بھی رہتی ہے اور لوگ ایک دوسرے کا حال بھی دریافت کرتے رہتے ہیں۔"

"کیا یہاں ہر ایک کے پاس اونٹ ہوتا ہے ——؟"

"علی سائیں، کیا شہر کے ہر آدمی کے پاس موٹر ہوتی ہے۔"

"نہیں کسی غریب کے پاس تو سائیکل بھی نہیں ہوتی۔ وہ لوگ بس میں یا پیدل سفر کرتے ہیں۔"

"یہاں بھی ہر ایک کے پاس اونٹ نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ غریب ہیں اور زیادہ تر پیدل سفر کرتے ہیں۔"

"پھر تو یہ لوگ بہت بہادر ہیں۔"

"بہادر ہی کہہ لیں، یا مجبوری سمجھ لیں۔"

علی چونک گیا۔ ایک معمولی سی لڑکی نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔

علی خاموش ہو گیا۔ اُس نے صرف اتنا کہا "چار بج رہے ہیں۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

تھوڑی دور آگے جا کے اُس نے اُونٹنی کی مہار بڑی مشاقی سے موڑی۔ اور پھر اونٹنی مخالف سمت میں تیزی سے بھاگنے لگی۔

علی نے اپنی دُوربین نکال کے اپنی آنکھوں پر لگا لی اور کھلے آسمان کے تلے کھلی زمین کا نظارہ لینے لگا ——

زمین ہی زمین، حدِ نظر تک زمین ——

بنجر اور ویران ——

ٹیلے یا خشک جھاڑیاں ——

زیادہ تر لمبی گھاس ہی نظر آتی ـــــ گھاس کا رنگ گہرا سبز، سُرخی مائل سبز
سنہری تھا۔ ریشم کے ریشوں کی طرح یہ سبز اور سنہری گھاس، ریت کے اودے سینے
پہ بے دھڑک کھڑی ہوتی تھی۔
سکھو کچھ دیر تو خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اُس نے مڑ کر علی کی طرف دیکھا ـــ کہ
خاموش کیوں ہو گیا ہے۔
"یہ آنکھوں پہ کیا لگا رکھا ہے علی سائیں" اُس نے پوچھا۔
"یہ جادو کی عینک ہے"
"جادو کی عینک ـــ؟"
"ہاں ـــ"
"وہ کیا ہوتی ہے"
"اس سے ہر دُور کی چیز نزدیک نظر آتی ہے"
"بھلا دور کی چیز نزدیک کیسے نظر آ سکتی ہے۔ تم شہری لوگ دیہاتیوں کو ہمیشہ
بے وقوف بناتے ہو"
"اچھا ـــ" علی نے دوربین لگاتے ہوئے کہا۔ "تم بھی یہی سمجھتی ہو"
"ہاں ہاں ـــ"
"تو میں تمہیں یہ عینک لگا دیتا ہوں"
"نہیں، میں نہیں لگاؤں گی"

وہ گھبرا گئی ـــــ
علی ہنسنے لگا ـــــ
راستے میں جا بجا پڑاؤ تھے۔ اونٹ گویا "شکل کے گھروندے ـــ دوربین لگا کر، تو
بادی کے کئی نشان نظر آتے تھے۔
سکھو کی جھوک ابھی چند فرلانگ پرے تھی۔ مگر دُوربین میں سے صاف نظر آ رہی تھی
علی نے جلدی سے دُوربین . . . . اپنی آنکھوں سے ہٹائی اور سکھو کی طرف بڑھائی۔
"مجھے نہ لگاؤ سائیں ـــ"
"دیکھو اپنا گھر دیکھو ـــ"
"میرا گھر ابھی دُور ہے۔ مجھے پتہ ہے"
"بھئی ذرا اس عینک میں تو دیکھو ـــ"
علی نے زبردستی دُوربین سکھو کی آنکھوں کے آگے لگا دی۔
چلتی ہوئی سکھو کا سر ایک جگہ ٹھہر گیا ـــــ
کچھ ثانیے وہ بے سُدھ سی دیکھتی رہی اور پھر ایک دم چلّا کر اُس نے دُوربین
ہٹا دی ـــــ
"ہٹاؤ میرا لالہ دیکھ رہا ہے"
علی نے دوربین ہٹا دی۔ "کہاں ہے تمہارا لالہ ـــ؟"
سکھو نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ سامنے کھلا صحرا تھا۔ اس کے گھر کا دُور

دُور تک پتہ نہ تھا۔ تب اُس نے بے یقینی سے علی کی طرف دیکھا۔

'میں نے کہا تھا نا؟ یہ جادو کی عینک ہے۔"

"ہاں.... ہاں.... واقعی....." اُس کی بڑی بڑی آنکھیں ابھی تک حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

"پھر لگاؤ گی؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ لالہ دیکھ لے گا تو مجھے مارے گا۔"

"پگلی، لالہ تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔ مگر تم لالہ کو دیکھ سکتی ہو۔ یہی تو اس عینک کا جادو ہے۔ لو خود لگا کر دیکھو۔"

سکھو نے اس کے ہاتھ سے دُوربین لے لی، ایک بار لگائی، دوسری بار، تیسری بار، ہر بار وہ دوربین ہٹا کر پھر ویرانے کی طرف دیکھتی ـــــ جب اسے اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ یہ اس کی جادو کی عینک کا کرشمہ ہے تو پھر وہ ایک تسلسل کے ساتھ دیکھنے لگی۔

'لالہ شاید ابھی شہر سے آیا ہے۔ سارا سامان نکال نکال کر زینو کو دے رہا ہے۔ نہیں۔ میری کرتی کا کپڑا لایا ہے یا نہیں.... ایک گٹھڑی تو بند پڑی ہے ـــ اور وہ دیکھو، تمہارے لئے چائے کے ڈبے بھی لایا ہے ـــــ"

"چائے تو بھئی ہمارے پاس بہت ہے۔" علی نے کہا۔ "تم نے اور کیا منگوائی؟"

"آپ ہمارے مہمان ہیں علی سائیں۔ ہم مہمانوں کی.... چیزیں لے کر استعمال نہیں کرتے۔ ویسے ہمیں اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ شہری لوگ سارا دن چائے پیتے ہیں۔"

"اور کیا اندازہ ہوا ہے تمہیں شہری لوگوں کے بارے میں۔"

"باتیں بہت کرتے ہیں.... اور سارا دن آوارہ گھومتے ہیں۔" سکھو نے دُوربین لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" علی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ پھر اُس نے ایک سگریٹ سلگا لیا۔

"اور ہاں سگریٹ بھی پیتے ہیں۔"

پھر ایک دم اس نے دُوربین علی کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ "میرا لالہ ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔ شاید مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ شام اُترنے والی ہے۔ ابھی بکریوں کے دُودھ دوہنے کا وقت ہو جائے گا۔ اونٹنی کو بھی بھوک لگی ہوگی ـــــ" اس نے مہار کھینچ کر اونٹنی کی رفتار تیز کر دی۔

جب وہ گھر کے قریب پہنچے تو سورج کا طشت بالکل سُرخ ہوگیا تھا ـــــ ریوں محسوس ہو رہا تھا، شام کی حسینہ سرخ گلال کا تھال اٹھائے زمین کے بالکل سینے رنگ ہی رنگ انڈیل رہی ہے۔

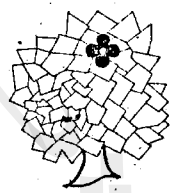

رات کو سونے سے پہلے علی نے لیمپ کی روشنی میں بے شمار صفحات
اور جب وہ کھلے آسمان کے تلے سونے کے لئے چارپائی پر لیٹا تو سوچنے لگا۔
آج سفر بھی بہت زیادہ کیا تھا۔ اور وہ تھکا بھی نہیں تھا، بلکہ روزانہ سے
معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ اور اس نے صحرا کی جو فلم بنائی تھی اس سے اُس
دل بہت مطمئن تھا۔

رات کے کسی پہر غالباً نمبردار آ گیا تھا ——

وہی معمول شروع ہو گیا۔

کبھی نمبردار اور کبھی اس کا بیٹا علی کے ساتھ چلا جاتا۔ اور پھر وہ پورے عا
میں گھوم پھر کر خوب معلومات اکٹھا کرتے۔ اور فلمیں بنایا کرتے۔

علی مرتضیٰ یہاں صرف چار ہفتے کے لئے آیا تھا۔ دو ہفتے گزر گئے
اب صرف دو ہفتے رہ گئے تھے۔

جس تیزی سے اس کا کام ہو رہا تھا۔ اس سے اسے خوب اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی میعاد تک کام مکمل کر لے گا۔

اس نے اپنے دفتر والوں کو مفصل خط لکھ دیا تھا۔ اس پُرسکون علاقے میں آ کر اُس کا بے حد لکھنے کو دل چاہتا —— سناٹا اتنا خوب صورت ہوتا کہ چاروں طرف بولتا ہوا محسوس ہوتا۔ ہر آواز اتنی صاف اور واضح سنائی دیتی کہ اسے خود اپنی سماعت پر رشک آنے لگتا —— اس روز وہ ایک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھا خط لکھ رہا تھا کہ اسے گھونگھروؤں کی آواز آئی ——

یقیناً سکھو ہو گی، اس نے دل میں سوچا —— اس وقت وہ بہت اہم خط لکھ رہا تھا۔ اور آج اس نے سوچا تھا کہ وہ کیتھی کو بھی مفصل خط لکھ دے گا ——

مگر وہی ہوا۔ سکھو اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"علی ساتیں۔ کیا کر رہے ہو یہاں ——؟"

"دیکھ نہیں رہیں۔ میں لکھ رہا ہوں"

"سارا دن لکھتے رہتے ہو۔ پتہ نہیں تمہیں لکھنے میں کیا مزہ آتا ہے"

"جو مزہ تمہیں بچوں کو گود میں اٹھانے سے آتا ہے" اس نے اس کی بغل میں ہرن دیکھ کر کہا۔

سکھو دھپ سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھنے سے اس کے سارے زیور ایک ساتھ بج اٹھے۔

"علی سائیں تم ذرا میرے ریچھوں کو اپنے پاس بٹھاؤ۔ میں ایک گھڑا پانی کا بھر لاؤں۔"

"نا بابا میں اس شیطان کا پہرہ نہیں دے سکتا۔"

"یہ کہیں نہیں جائے گا۔ بس تھوڑی دیر بعد اس کے آگے یہ گھاس ڈالتے رہنا۔"

"یہ گھاس ہے؟" علی نے گھاس کو ہاتھ سے چھوا۔ "یہ تو ریشم معلوم ہو رہی ہے۔"

"ہاں یہ یہاں کی خاص گھاس ہے۔ اسے لمب کہتے ہیں اور یہ زیادہ تر ہرن کھاتے ہیں۔"

"یہ کس علاقے میں ہوتی ہے۔ مجھے وہاں لے چلو ——"

"یہ بھی میدانی علاقے میں ہوتی ہے اور آج کل کثرت سے ہوتی ہے جس دن کہو گے وہاں لے چلوں گی۔"

"تو اس کا مطلب ہے، آجکل ہرن بھی کثرت سے ہوں گے۔"

"ہوں گے تو ——"

"کیوں نہ ہرن کا شکار کیا جائے ——"

"نہ سائیں نہ ——" سکھو نے جلدی سے اپنا ہرن اُٹھا لیا۔

"بھئی تمہارے ہرن کی بات نہیں کر رہا۔ جنگلی جانوروں کی بات کر رہا ہوں۔"

"مجھے ہرن کا شکار کھیلنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔"

"کیوں ——؟ لوگ تو اس علاقے میں زیادہ تر شکار کھیلنے ہی آتے ہیں۔"

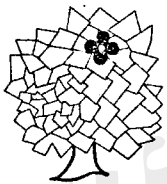

قلعہ دراوڑ کے پرانے کھنڈرات کے آس پاس گھوم کر علی نے بیشمار فلمیں بنائیں۔ آثارِ قدیمہ کے نقوش ڈھونڈنے اور تصویریں بنانے میں ہی اس نے دوپہر کے دو بجا دیئے۔ اللہ دسایا صبح ہی اُن کو یہاں چھوڑ گیا تھا اور طفیل منہ پر کپڑا ڈالے جیپ میں سو رہا تھا۔ طفیل کو صدہا پرانے کھنڈروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کہتا تھا۔ صاحب جی کا دماغ خراب ہے۔ جن بادشاہوں کی ہڈیاں بھی خاک ہو گئی ہیں، یہ ان کے نشانات ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

علی اپنے کیمرے اور فائل سنبھال کر باہر نکلا۔ تو اُسے یوں محسوس ہوا، اسے کہیں سے گھونگھروؤں کی آواز آئی ہے۔

یار کمال ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ اس ویرانے میں گھونگھرو بہت بجتے ہیں

"ہاں میں نے جب پہلے پہل تمہیں دیکھا تھا۔ تو تمہیں بھی شکاری ہی سمجھا تھا۔ م
اللہ کا شکر ہے۔ تم شکاری نہیں نکلے۔"

"میں بھی شکاری ہوں۔" علی نے اپنی آنکھوں میں تمام تر شرارت سمو کر کہا۔ "مگ
بولنے والے ہرنوں کا شکار کرتا ہوں، بلکہ ہرنیوں کا ——" یہ کہہ کر اس نے ا
طرح سکھو کی آنکھوں میں دیکھا کہ وہ ایک دم سُرخ ہو گئی۔ بلکہ تھوڑی دیر کے لئے
گئی —— اور پھر اپنے حواسوں کو یکجا کر کے بولی۔

"یہ پنوں ہے نا پنوں —— یہ جب ایک ماہ کا تھا تو کسی شکاری نے ا
کی ماں کو گولی مار دی تھی۔ پھر میں نے اُسے بڑے پیار سے پالا ہے، اسی لئے
شکاری بُرے لگتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ پالتو ہرن ہے یا جنگلی ——"

"مگر تم نے تو اس کے پاؤں میں گھونگھرو ڈال رکھے ہیں۔"

"اسی لئے تو ——" وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر بولی۔

آنکھیں اس طرح نہ کھولو۔ ایسا نہ ہو۔ میں اپنی بندوق اُٹھالوں ——"

"بندوق کیوں اٹھاتے ہو ساتیں، میں تو ویسے ہی نشانہ بن گئی ہوں۔" یہ کہ
—— اور اپنے پاؤں کے گھونگھرو بجاتی ہوئی وہ گھر کی طرف بھاگ گئی۔ معصو
بھولا بھالا ہرن علی کی طرف دیکھنے لگا۔ علی نے اُسے چمکار کر تھوڑی سی گھاس اُ
آگے کر دی۔ اور پھر لکھنے لگا۔

سکھو نے کافی دیر لگا دی تھی۔ دن ڈھلنے لگا تھا اور وہ ہرن کا پہرہ دیتے

تھک گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے کمیتھی کو مفصل خط بھی لکھ دیا۔ اور شام ڈوبنے کا منظر وضا
سے لکھا تھا۔ وہ لکھتے لکھتے چونک گیا، جب ایک لمبا سایہ اُس کے سامنے آکر ٹھہر
لیا۔ اُس نے ڈر کر سر اٹھایا تو پھر دیکھتا رہ گیا۔

سکھو اپنے سر پر پانی کا بھرا ہوا مٹکا لئے کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے
مٹکا تھام رکھا تھا۔ اس کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ سورج کی لال لال شعاعیں
اس کی باریک کالی کرتی کے آر پار ہو رہی تھیں —— اور اُف اللہ

وہ اپنی ہیئت سے آپ ہی بے خبر تھی۔

زمین پر بیٹھا ہوا علی تھرا گیا ——

اتنا مکمل حُسن ان نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

"وہیں رُک جاؤ سکھو، رک جاؤ۔" علی نے چیخ کر کہا۔

"میں تمہاری ایک شاہکار تصویر بنانا چاہتا ہوں۔"

ہنستی ہوئی سکھو بل کھا کر وہیں رک گئی۔ علی دوڑ کر گیا۔ اندر سے کیمرہ اٹھا لایا
پھر اس نے ہر ہر زاویے سے سکھو کی بے شمار تصویریں بنا ڈالیں، حتیٰ کہ وہ گھڑا تھامے
تھک گئی اور چلانے لگی۔

تب علی کو خیال آیا کہ اس نے پانی سے بھرا ہوا مٹکا اٹھا رکھا ہے۔

علی نے آگے بڑھ کر اس کا گھڑا اتروا دیا تو وہ ایک طرف بیٹھ کر ہانپنے لگی
اس کا ہرن آہستہ آہستہ چلتا ہوا خود ہی اُس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

علی نے اس کی کچھ اور تصویریں بنا ڈالیں ـــــ پھر اس کے چہرے کی چمکتی ہ
ے پینے لگا۔

"اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو علی سائیں ـــــ ؟"

"تم جو پُنوں کو چمکار رہی ہو۔ تو مجھے بیحد حسد محسوس ہو رہا ہے۔"

"ہاں، پُنوں سے مجھے بہت پیار ہے۔"

"تمہارا نام تو سسی ہونا چاہیئے تھا۔"

"کیوں ـــــ ؟"

"کیوں کہ تم سسی سے بھی حسین ہو۔"

"نہ سائیں نہ ـــــ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ سُنا ہے سسی تھل کے ریگستانوں
سسک سسک کر مر گئی تھی۔"

"ارے یہ سب کہانیاں ہوتی ہیں۔"

"جھوٹی باتیں ہیں سائیں ـــــ"

"ہاں بالکل ـــــ"

"لیکن مجھے اچھی لگتی ہے۔"

"کیا ـــــ ؟"

"سسی ـــــ سسی نے اپنے پیار کی خاطر جان دے دی۔"

"تو پھر میں تمہیں سسی کہہ کر بلایا کروں گا۔"

"مگر... مگر..." اس نے ہرن کو گود میں اٹھا لیا۔

"میرا پنوں تو کوئی نہیں ـــــ"

یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی ـــــ

"ارے یہ گھڑا تو اٹھاتی جاؤ ـــــ"

مگر وہ دوڑ گئی تھی۔

شام کو جب علی مرتضیٰ چہل قدمی کر کے لوٹا.... تو سکھو بکری کے تھنوں میں
مُنہ دیئے بیٹھی تھی۔ مگر اس کے گنگنانے کی صاف آواز آ رہی تھی ـــــ

تساں بادشاہ ہو ساکو غریبی
تساں ول نہ ولسّاں ساڈی بے نصیبی

(تم شہنشاہ ہو۔ اور میں ایک غریب لڑکی ہوں۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ تم
پردیسی ہو۔ جاؤ گے تو پھر لوٹ کر واپس نہ آؤ گے)

رات کو جب وہ دودھ کا بھرا ہوا گلاس لے کر علی کے "گوپے" میں دینے آئی ـــــ
تو علی نے کہا۔

"گانا تو تم بہت اچھا گا لیتی ہو۔ آج شام میں نے سُنا ہے۔"

"اچھا" وہ شرما گئی۔

"لیکن تم روز دودھ کیوں لے آتی ہو۔ میں نے تمہیں بتایا تھا۔ شہری لوگوں کو
دودھ پینے کی عادت نہیں ہوتی۔"

"علی سائیں۔ یہاں اس موسم میں دودھ پینا صحت کے لئے ضروری ہے۔" وہ
توقف سے بولی۔ "آپ کو پتہ ہے۔ ہم دودھ میں شکر نہیں ملاتے۔"

"اچھا۔" تو پھر دودھ میٹھا کیسے ہوتا ہے ——؟"

"بس، اللہ کے کرم سے میٹھا ہو جاتا ہے۔ ہم سب ایسے ہی پیتے ہیں۔"

"میں بتاؤں کیوں میٹھا ہوتا ہے۔" علی نے ہنس کر کہا۔ "تم جیسی خوبصورت لڑکی
کے ہاتھوں سے نکلتا ہے۔ اس واسطے میٹھا سا آجاتی ہے ——"

اس بات پر وہ ہنسی اور شرما کر باہر نکل گئی۔

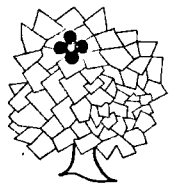

قلعہ دراوڑ کے پرانے کھنڈرات کے آس پاس گھوم کر علی نے بے شمار فلمیں بنائیں۔
آثارِ قدیمہ کے نقوش ڈھونڈنے اور تصویریں بنانے میں ہی اس نے دوپہر کے دو بجا دیئے۔ اللہ دیا
صبح ہی اُن کو یہاں چھوڑ گیا تھا اور طفیل منہ پر کپڑا ڈالے جیپ میں سو رہا تھا۔ طفیل کو صدہا پرانے
کھنڈروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کہتا تھا صاحب جی کا دماغ خراب ہے۔ جن بادشاہوں کی ہڈیاں
بھی خاک ہو گئی ہیں۔ یہ ان کے نشانات ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

علی اپنے کیمرے اور فائل سنبھال کر باہر نکلا۔ تو اُسے یوں محسوس ہوا، اُسے کہیں سے گھونگھروؤں کی آواز آئی ہے۔
یار کمال ہے! اُس نے دل میں کہا۔ اس ویرانے میں گھونگھرو بہت بجتے ہیں۔ یا پھر سناٹے کی آواز ایسی
ہی ہوتی ہے۔ ایک جھاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کے وہ بیٹھ گیا۔ —— بھوک بھی محسوس ہو
رہی تھی اور ابھی فلاسک میں تھوڑی سی چائے تھی۔

"علی سائیں ——"

ایک موسیقی بھری آواز گونجی اور وہ ٹھٹھک گیا۔ سامنے سے غالباً سکھو چلی آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ
ایک اور لڑکی بھی تھی۔ جب وہ چلتیں تو دونوں کے گھاگھرے ایک خوبصورت زاویے بناتے، جنہیں اُن
کے قدم توڑ دیتے، جس طرح کوئی سمندر کی سرکش لہروں کو پاؤں مار مار کر توڑتا ہے —— علی ادھر
دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے کیمرہ سنبھال لیا۔

جب وہ قریب آئیں۔ تو ایک لڑکی نے اپنی ٹکار (چادر) میں اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔

"ہمیں دیر تو نہیں ہوئی علی سائیں ——" سکھو نے دم بھی نہ لیا اور بولنے لگی۔ "لالہ اللہ دسایا
کہہ گیا تھا کہ آپ کو یہاں کھانا پہنچانا ہے، مگر ہمیں پیدل چلتے چلتے دیر ہو گئی۔"

"کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ میں تو ابھی کام ختم کر کے بیٹھا ہوں۔"
سکھو کھانے کی گٹھڑی کھولنے لگی۔ تو علی نے پوچھا۔
"یہ کون ہے ——؟"
"ہائے اسے نہیں پہچانتے ——"، سکھو نے ذرا اٹھلا کر خفگی کا اظہار کیا۔
"یہ میری بہن زینو ہے۔ اتنے دن ہوئے تمہیں یہاں آئے۔ اور اسے بھی نہیں جانتے"
"بھئی میں اسے کیسے پہچانوں گا۔ یہ تو گھر میں بھی ہر وقت بکل میں منہ چھپائے رکھتی ہے۔"
"کپڑا ہٹا زینو ——"، یہ کہہ کر سکھو نے شوخی سے زینو کی چادر کھینچ لی۔ جس سے اس کا چہرہ ننگا ہو گیا۔
زینو نے ہنس کر اپنی نظریں جھکا لیں۔
علی نے دیکھا وہ بھی اتنی خوبصورت لڑکی تھی۔ وہی نوکیلے نین نقش۔ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں۔ باریک لب۔ سنہرا اور سرخ رنگ —— اتنے ہی زیور —— وہی حلیہ ——، مگر اس کے چہرے پر ایک حزن تھا۔ ایک اداسی تھی۔ ایسا کرب تھا جو صاف پڑھا جاتا تھا۔
"بڑی اچھی ہے تمہاری بہن، مگر ہم سے پردہ کیوں کرتی ہے؟"
"یہ ڈرپوک ہے ——"، سکھو نے کہا۔ تو زینو نے بے قراری سے پہلو بدلا۔
"تو بیٹھ، میں ذرا پانی بھر آؤں ——"

علی نے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک تانبے کی گاگر تھی۔ وہ گاگر اٹھا کر ایک طرف کو چل دی۔
"تم نے اپنی بہن کو خفا کر دیا ہے۔"
"نہیں۔ وہ شرمیلی ہے ذرا ——"
"یہ اتنی چپ چپ اور اداس کیوں رہتی ہے؟"
"علی سائیں!" سکھو ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "بیچاری کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔"
"کیا ظلم ہوا ہے بھئی ——؟"
"اس کے شوہر نے اسے گھر سے نکال دیا ہے ——"
"ہیں!" علی حیرت سے بولا۔ "یہ شادی شدہ ہے۔"
"ہاں اور اس کا ایک تین سالہ بچہ بھی ہے۔"
"اس کے شوہر نے اسے کیوں نکالا ہے —— یہ تو اتنی خوبصورت ہے۔"
"بس کیا بتاؤں سائیں۔ تم نہیں سمجھ سکو گے۔"
"تم سمجھانے کی کوشش تو کرو۔"
"وٹہ سٹہ جانتے ہو؟"
"تو یہاں لوگوں کو وٹے سٹے کی شادیاں برباد کرتی ہیں۔"
"زینو کے شوہر کالو کی بہن داری میرے بھائی اللہ وسایا کی بیوی ہے۔ ایک دن اللہ وسایا اور داری میں جھگڑا ہو گیا۔ داری روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی۔ اسی وقت کالو نے

میری بہن زینو کو دھکے دے کر نکال دیا اور بچہ بھی چھین لیا۔"

"اچھا۔ پھر تم لوگوں نے صلح صفائی کیوں نہیں کرائی؟"

"یہ جو اللہ دسایا ہے نا، غصّے کا بڑا زہری ہے۔ کہتا ہے خود آکر معافی مانگے اور میری بہن کو لے جائیں۔"

"وہ کیوں نہیں آتے؟"

"وہ کہتے ہیں۔ پہلے تم لوگ آکر میری بہن سے معافی مانگو۔"

"اور اس طرح یہ معاملہ لٹک رہا ہے۔"

"ہاں ——"

اور یہ کب تک چلے گا ——؟"

"اللہ جانے ——" سکھو نے اداسی سے جواب دیا۔ "بعض اوقات تو عمریں گزر جاتی ہیں۔"

"اچھا۔ یہ تو بُری بات ہے۔" علی نے کہا۔ پھر اسے اُداس دیکھ کر بولا —— "کہیں تیرا تو وٹہ سٹہ نہیں ہو رہا ——"

"نہیں ——" وہ ایک دم چونک گئی۔ بھر گبھرا گئی۔ اور بولی۔ "سائیں کھانا تو لو۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

اُس نے دسترخوان کھول کے اس کے آگے بچھا دیا۔

موٹی موٹی تنور کی روٹیوں کی مہک اور سالن کی خوشبو نے علی کی بھوک

دیا۔ پہلا نوالہ منہ میں ڈال کر بولا۔

"تم کھانا بہت مزے کا پکاتی ہو۔ واہ واہ مزہ آگیا۔"

"بھلا بوجھو تو میں نے کیا پکایا ہے۔ یونہی تعریف کئے جاتے ہو۔"

"مجھے اس سے کیا غرض کہ تم نے کیا پکایا ہے۔ بس یہی کافی ہے کہ میں تمہارے ہاتھ کا پکا کھا رہا ہوں۔"

سکھو کا منہ سرخ ہو گیا۔ مگر وہ بولی۔

"میں نے آج خاص طور سے تمہارے لئے "پھگوسی" پکائی ہے۔"

"پھگوسی" کیا ہوتی ہے بھئی ——"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسی ——

"جس جھاڑی کے ساتھ تم ٹیک لگا کر بیٹھے ہو نا؛ اُسے پھوگ کی جھاڑی کہتے ہیں۔ اس پہ جو پھل لگتا ہے۔ ہم اُسے "پھگوسی" کہتے ہیں —— اور اسے مختلف طریقوں سے پکا کر کھاتے ہیں۔"

"اچھا ——" نوالہ منہ میں رکھ کے علی نے مڑ کر اس جھاڑی کو دیکھا۔ اس پہ آم کی طرح کا بور لگا ہوا تھا۔ پک کے اس کی شکل مختلف ہو گئی تھی۔

"بھئی پکانے والی کا کمال ہے۔ اگر تم کھلانے سے پہلے مجھے بتاتیں تو میں کبھی یقین نہ کرتا کہ اس جھاڑی کا پھل اس قدر مزے دار ہو سکتا ہے ——"

"کسی دن میں تمہیں "کریہیں" کا پھل بھی پکا کر کھلاؤں گی۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہ بھی ایک درخت ہوتا ہے، مگر ہم اس کا پھل پکا کر کھاتے ہیں۔"

"اور کیا کیا کھاتے ہو تم لوگ۔ بتا دو ——"

"ہم غریب جو ہوئے علی سائیں! ہمارے ہاں شہروں والی سبزیاں نہیں ہوتیں۔ شہر سے سبزیاں تو ہم مہمانوں کے لئے منگواتے ہیں۔ قدرت جو کچھ ہمیں دے دیتی ہے ہم اس پر قناعت کرتے ہیں۔"

"تم مجھے یہ بتاؤ سکھو کہ تم نے اتنی سمجھداری کی باتیں کہاں سے سیکھیں؟"

"یہ کوئی سمجھداری کی باتیں ہیں۔ یہ تو یہاں کا بچہ بچہ جانتا ہے۔"

وہ زور سے ہنسی۔

علی نے جب کھانا کھا لیا تو سکھو نے کہا۔ "لاؤ میں تمہارے ڈرائیور کو کھانا دے آؤں۔"

"تم نہیں جاؤ۔ وہ خود یہاں آجائے گا۔" علی نے طفیل کو آواز دی کہ آکر کھانا لے جاؤ۔ کھانے کی آواز سن کر طفیل کی آنکھ کھل گئی —— دوڑا آیا —— اور کھانا اٹھا کر لے گیا۔

"تو تم نے یہ سارا قلعہ دیکھ لیا ہے۔" سکھو نے پوچھا۔

"کیا تم نے قلعہ مروٹ بھی دیکھ لیا ہے —— وہ جس کا پہلے دن پوچھ رہے تھے۔"

"دیکھا تو ہے۔ وہ مجھے بہت پسند آیا ہے۔ ابھی وہاں فلم بنانے کے لئے ایک

دن اور جانا ہے۔"

"جس دن وہاں جاؤ مجھے ساتھ لے جانا۔"

"کیوں ——؟"

"مجھے بھی قلعہ مروٹ بڑا اچھا لگتا ہے۔ میں وہاں کئی دفعہ گئی ہوں۔ جتنی باتیں اس کے بارے میں میں جانتی ہوں۔ کوئی اور نہیں بتا سکتا ——"

"ہاں یہ میں جانتا ہوں۔ تو بڑی باتونی ہے۔"

سکھو ہنسنے لگی۔

"کل تو میں قلعہ سبحنور دیکھنے جاؤں گا۔ اگلے ہفتے قلعہ مروٹ دیکھیں گے۔"

اتنے میں گھونگھرو بجنے کی پھر آواز آئی۔

دور سے ایک ہیولا سا نظر آنے لگا۔ غالباً زینو پانی بھر کر آرہی تھی۔

"زینو آجائے گی نا؟ تو میں تم دونوں کی تصویریں بناؤں گا۔"

"بس تصویریں ڈبی کے اندر ہی بناتے رہتے ہو۔ کبھی نکال کر تو دکھاتے نہیں۔"

"یہ سب ایک بار ہی نکالوں گا۔"

"کب؟"

"جب شہر جاؤں گا۔ پھر وہاں سے آکر تمہیں دکھاؤں گا۔"

"شہر جانے والے دوبارہ نہیں آتے۔ مجھے معلوم ہے سائیں۔" سکھو نے ڈوب کر کہا۔

"میں ضرور آؤں گا سکھو۔" اُس نے سکھو کی سیاہ اور گہری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تمہاری خاطر آؤں گا۔ وعدہ کرتا ہوں ——"

"علی سائیں ——!"

"ہاں وعدہ کرتا ہوں!"

سکھو نے اپنی مدھ بھری آنکھیں جھکا لیں۔ پھر اُس نے دُور سے آتی ہوئی اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ اور آواز آہستہ کر کے بولی۔

"میں نے زینو کو بتایا تھا کہ تم نے میرا نام سسی رکھ دیا ہے۔"

"اچھا ——" علی نے دلچسپی سے کہا۔ "پھر؟"

"زینو کہنے لگی یہ بڑی خطرناک بات ہے ——"

"اچھا... اور کیا کہا زینو نے....."

"اور... اور..." سکھو شرما گئی... "وہ مجھے ڈانٹ رہی تھی کہہ رہی تھی۔"

سکھو بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ زینو قریب آ گئی تھی۔

علی نے اُٹھ کر اپنا کیمرہ سنبھالا اور ان دونوں کی تصویریں اتارنے لگا

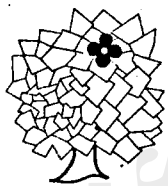

علی نے اپنے گوپے سے باہر نکل کر دیکھا۔ تو باہر جشن کا سا سماں تھا۔ سارے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ دُور دُور تک چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن پر ہاتھ کے بنے ہوئے خوبصورت کھیس بچھے ہوئے تھے اور لوگ رنگ برنگے کپڑے پہن کر آ رہے تھے۔ حقے بھی چل رہے تھے اور سگریٹیں بھی۔ روشنی کے لئے گیس کے ہنڈولے لگائے ہوئے تھے۔ علی نے جائزہ لیا۔ تو روشنی کا انتظام خاطر خواہ تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ آج رات بھی وہ ایک فلم بنا لے۔ اندر آ کر وہ اپنی فلیش گن میں نئے بلب لگانے لگا۔

اسی وقت جھن جھن کرتی سکھو اندر آ گئی۔

اُس نے نظر اٹھائی اور پھر دیکھتا رہ گیا۔ آج سکھو کی سج دھج سب سے نرالی تھی —— لال کرتی۔ سبز لہنگا اور کالی چنری —— ہونٹوں پر دنداسا ——

آنکھوں میں کاجل ـــ کرتی کے اوپر موتی اور منکے ٹکے ہوئے تھے۔

"ٹھہرو میں تمہاری تصویر بناتا ہوں۔"

"ہُش . . . ." سکھو نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ "باہر سب مہمان آئے ہیں۔ میں تو یہاں سے یہ پیڑھا اُٹھانے آئی ہوں۔"

اس نے جھک کر پیڑھا اٹھایا۔ اُس کے تمام خدوخال جیسے روشن ہو گئے۔ علی کو اپنے دل میں ایک ٹیس سی محسوس ہوئی یہ لڑکی اس کا ایمان متزلزل کر رہی ہے اور وہ دل کو سمجھا سمجھا کے تھک گیا تھا کہ وہ ان کا مہمان ہے ـــ اور مہمان کے آداب ہوتے ہیں۔ سکھو باہر نکل گئی اور وہ دل کو پکڑ کر رہ گیا۔

اسے کیا پتہ تھا کہ اس جشن پر یہ قیامت آئے گی۔

بات صرف اتنی تھی کہ صبح وہ گاؤں کے دو چار لوگوں کو ساتھ لے کر شکار کھیلنے گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا تفریح بھی ہو جائے گی اور ساتھ فلم بھی بن جائے گی۔ جانے سے پہلے سکھو نے اُسے سب معلومات بہم پہنچائی تھیں۔

"بھتی ہرن کے علاوہ یہاں اور کیا شکار ہو سکتا ہے؟" اُس نے سکھو سے براہِ راست پوچھ لیا۔

"ایک پرندہ ہوتا ہے، جسے ہم تلور کہتے ہیں۔ وہ اس جگہ پایا جاتا ہے۔ جہاں "بھ" اور "بھکڑ" کی جھاڑیاں ہوتی ہیں۔"

"بھتی یہ "بھیل" اور "بھکڑ" کیا ہوتا ہے؟"

"دو جھاڑیاں ہوتی ہیں۔" سکھو نے اپنی لمبی پلکوں والی آنکھیں جھپک جھپک کر کہا ساتھ ساتھ اُگتی ہیں۔ ان کو لوگ عاشق و معشوق کہتے ہیں۔"

"کیوں ـــــ؟"

"جب موسم بہار آتا ہے نا ـــــ؟" پھر اُس نے شرما کر اپنی اوڑھنی کا کونہ منہ میں دبا لیا۔

"تو کیا ہوتا ہے ـــــ؟"

"یہ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتی ہیں۔"

"پھر تو واقعی بڑی رومانٹک جھاڑیاں ہیں۔"

"تلور انہی کے اردگرد رہتا ہے ـــــ"

"کیوں تلور ان سے جلتا ہے؟"

"نہیں وہ ان سے خوراک حاصل کرتا ہے۔"

سکھو نے اُسے سمت بتائی۔ جس طرف یہ جھاڑیاں زیادہ ہوتی ہیں۔

"ایک اور پرندہ بھی ہے۔" سکھو نے کہا۔

"اسے "بھک" کہتے ہیں۔ اُس کا بھی لوگ شکار کرتے ہیں۔"

"بھتی تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتیں . . . . تمہیں دیکھ کر تو خواہ مخواہ شکار ہماری طرف آئے گا۔"

"نہ . . . . نہ . . . . ساتیں ـــــ" وہ گھبرا گئی۔

"اتنے آدمی تمہارے ساتھ جا رہے ہیں۔ لالہ مجھے مار ڈالے گا۔"

"پھر کیا خیال ہے تمہارا میں شکار کر سکوں گا؟"

"ہاں ہاں ——" وہ ہنس کر بولی۔ "اگر تم بہت زیادہ شکار لائے۔ تو میرا بابا تمہارے قبیلے کی دعوت کرے گا۔"

"اچھا کیا تم نے مجھے یہ بتا دیا۔"

اور پھر آج علی نے اُن پر اپنے شکار کی دھاک بٹھا دی تھی —— دس بارہ مارے تھے۔ تیس چالیس تلور۔ اور اتنے ہی "بھک" گولی کا نشانہ بنائے تھے ——

اور اب باہر سارے قبیلے کی دعوت تھی۔ اور دعوت میں اپنے معزز مہمان کا کرایا جانا تھا۔

علی اپنے کیمرے کو صاف کرنے لگا۔

اتنے میں اللہ دسایا اُسے بلانے آیا۔

جب وہ باہر نکلا تو ہر آدمی کھڑا ہو کر اُس سے ملا۔ علی نے دیکھا تمام مرد اونچے لمبے اور سانولے تھے۔ اُن کے رنگوں میں زردی کی آمیزش زیادہ تھی۔ جبکہ عورتوں کے رنگ میں سُرخی کا عنصر غالب تھا۔ مردوں نے بھی لال پیلے، نیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔

ذرا دور چارپائیوں پر عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور سکھوان سب میں نمایاں تھی۔ ایک طرف آگ کے الاؤ جل رہے تھے۔ جن پر ہرن اور پرندے بھونے جا رہے تھے

اشتہا انگیز خوشبو سارے ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔

کھانے کے بعد موسیقی کی محفل کا اہتمام تھا۔

اور علی یہ جان کر حیران رہ گیا کہ انہیں موسیقی پر خاصی دسترس تھی۔ پہلے تو انہوں نے عورتوں کو گانے کا موقع دیا۔ دو رچارپائیوں پر..... بیٹھی ہوئی عورتوں نے گھڑا اور رات بجا کر لوک گیت گاتے —— پھر ایک درد بھری لے اُبھری۔ علی نے فوراً پہچان لیا ——

اب سکھو تنہا گا رہی تھی۔

دِل نال سجن دے لائی راہساں

میں تاں پریت دی ریت نبھائی راہساں

(میں نے جیون بھر کے لئے اپنے محبوب سے دِل لگا لیا ہے اور دم آخر تک پریت کی ریت نبھاؤں گی۔)

جدّاں دِل دا حال سُنڑیاں میں

دی شرماں بہوں کریاں میں

نظراں دے تیر جھکائی راہساں —— میں تاں پریت دی ریت نبھائی راہساں

(جب میں اپنے ساجن سے اپنا حالِ دل کہوں گی۔ تو مجھے کس قدر شرم آئے گی۔ مارے لاج کے میں تو نظریں اٹھا ہی نہ سکوں گی لیکن پھر بھی دم آخر تک پریت کی ریت نبھاؤں گی)

سکھو کی آواز میں بڑا سوز تھا۔ بڑا تیج تھا۔ یہ آواز اُن سب آوازوں سے
مختلف تھی جنہیں وہ ریڈیو یا ٹی وی پر سنتا تھا ـــــ کسی بھی ملاوٹ سے پاک
مصفا اور مقدس آواز۔ سکھو کا گیت سُن کر علی اداس ہو گیا۔ جانے کیوں ـــ اُسے
ایسے لگا ـــ جیسے ـــ سکھو کراہ رہی ہے ـــ رو رہی ہے۔ التجا
کر رہی ہے۔

کوئی اسے اس کرب سے نجات دے۔

سوچتے سوچتے جانے وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ جب اچانک اُسے
احساس ہوا کہ مردوں کی محفل شروع ہو چکی ہے ـــ ایک سیاہ رنگ کا سُرخا
والا آدمی ـــ اپنی لمبی اور پرسوز لے میں گا رہا تھا ـــــ

درد وندان کوں درد گھنیرے
بیدرد کلھوٹے ٹھلے
پتھر رہے وچ پانی دے
نہ وانگ پتاشے گھلے
دانا شودے بھل وینڈے اَتے مورکھ مُول نہ بھلے

(جن کے دل میں درد ہے۔ ان کو غم مل ہی جاتے ہیں۔ لیکن بے حس، بے درد لوگ
اپنے تن و توش میں مگن رہتے ہیں۔)

(جس طرح پتھر ہزار ہا سال پانی میں پڑا رہے تو ذرا سا بھی نہیں گھلتا۔ لیکن بتاشا

تا نازک ہوتا ہے کہ پانی لگتے ہی تحلیل ہو جاتا ہے۔)

(بہت سی باتیں ایسی ہیں جنہیں دانا لوگ بھی درخور اعتنا نہیں سمجھتے لیکن نادان
وگ اُسے پلو سے باندھ کر جیون بھر کا روگ مول لے لیتے ہیں۔)

رات گئے تک موسیقی کی یہ محفل جمی رہی۔ خود علی کا اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا
تھا۔ اسے پہلی مرتبہ یہ تجربہ ہوا کہ صحرا نشینوں کی آواز میں اس قدر درد ہوتا ہے ـــ
ک ہوک ہوتی ہے ـــــ آہ ہوتی ہے ـــــ کراہ ہوتی ہے ـــــ
ڈوب کر گاتے ہیں۔ اور کلیجہ چیر کر رکھ دیتے ہیں ـــــ ایک آدمی نے اس
کے استفسار پر بتایا کہ یہ "بھیروی اور سندھڑا" راگ کو ملا کر اس کا الاپ کرتے ہیں۔

خیر جو بھی راگ تھا۔ دل میں اُتر جانے والا تھا۔

علی کو اندازہ ہوا کہ ہم جو موسیقی لوک گیت کی صورت میں ٹی وی اور ریڈیو
پر پیش کرتے ہیں وہ ان کی اصل موسیقی کی روح نہیں ہوتی، بلکہ اُس میں ہمارے
فن کار اپنی مرضی سے ملاوٹ کرتے ہیں۔ کاش اس کے پاس ریکارڈنگ سسٹم
ہوتا اور وہ ان کی موسیقی بھی ریکارڈ کر کے لے جاتا اور دنیا کو بتاتا کہ جنگل میں کیسی
کیسی آگ روشن ہے ـــ اور کیسے کیسے پھول کھل رہے ہیں۔

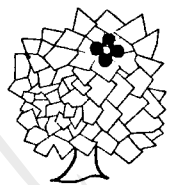

علی مرتضیٰ جب تیار ہو کر اپنے "گوپے" سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا۔ نمبردار اللہ دسایا کے پاس ایک اور نوجوان بیٹھا ہوا ہے ـــــ یہ اونچا لمبا کڑیل جوان تھا۔ مگر زرد رُو تھا۔

علی نے محسوس کیا کہ باہر نکلتے ہی اس نوجوان نے ایک تیز مگر نا قدانہ نظر اس پر ڈالی تھی۔ جانے کیوں علی کو اس کی نگاہ چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی ـــــ بہرحال وہ اخلاقاً ان کے قریب گیا۔ اس سے ہاتھ ملایا۔ اور اپنا روزمرہ کا پروگرام نمبردار کو بتایا۔ اب علی وہاں کے راستوں سے واقف ہو گیا تھا۔ اس لئے بے کھٹکے جدھر چاہتا نکل جاتا ـــــ پھر بھی نمبردار چاہتا تھا، وہ کسی نہ کسی مقامی آدمی کو ساتھ رکھا کرے۔ کسی بھی وقت بھٹک جانے کا خطرہ تھا۔

اور جب کوئی ساتھ جانے والا نہ ہوتا تو نمبردار اسے علاقے کی سمتیں بتا دیتا اور پھر یہ بھی کہہ دیتا کہ سکھو بازیو اُس کو فلاں جگہ کھانا پہنچا دیں گی۔ تاکہ انہیں

ہو سکے کہ وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکا ہے۔

آج بھی نمبردار نے اسے سمتیں سمجھا دیں اور ساتھ ہی بتا دیا کہ جب وہ فلاں پہنچے گا تو اُس کا کھانا اُسے مل جائے گا۔

علی خدا حافظ کہہ کے روانہ ہو گیا۔

دوپہر کو اپنے مخصوص وقت پر سکھو کھانا لے آئی تھی۔

آج خلافِ معمول سکھو گپ چپ اور گم صم سی تھی۔ نہ وہ شوخی نہ چلبلاپن۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"آج کیا پکا کر لائی ہو ـــــ؟" علی نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"آج میں نے تمہارے لئے کھمبیاں پکائی ہیں۔"

"کھمبیاں ـــــ؟ کھمبیاں کیا ہوتی ہیں ـــــ؟" علی نے سالن کا ڈھکن اٹھایا ـــــ تو اسے کالی اور سفید چھوٹی چھوٹی چھتریاں سی پلیٹ میں نظر آئیں۔

"یہ تو چھتریاں ہیں بھئی ـــــ"

سکھو ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی میں وہ کھنک نہ تھی۔

"یہ چھتریاں نہیں کھمبیاں ہیں.... صحرا میں جب بارش ہوتی ہے نا؟ تو اس کے فوراً بعد ایک بوٹی اُگ آتی ہے۔ اس پر یہ کھمبیاں لگتی ہیں اور ہم لوگ انہیں پکا کر کھاتے ہیں۔"

"مگر۔ مگر کل تو بارش نہیں ہوئی۔"

"ہاں، یہاں ترس ترس کر بارش ہوتی ہے۔ اس لئے ہم یہ کھمبیاں ایک ہی دفعہ توڑ لیتے ہیں اور پھر سکھا کر رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی خاص مہمان آئیں انہیں پکا کر کھلاتے ہیں۔"

"تو اس کا مطلب ہے ——— میں خاص مہمان ہوں۔" علی نے شوخی سے کہا۔

"تمہیں کیا پتہ کہ تم کیسے مہمان ہو ———؟" یہ کہہ کر سکھو نے دور افق پر نظر جما دیں۔

علی کھانا کھانے لگا۔ جب وہ کھا چکا تو بولا۔

"ایک بات بتاؤ سکھو، اور سچ سچ بتاؤ۔"

"جی سائیں ———"

"آج تم اتنی اُداس کیوں ہو؟"

"کوئی بات نہیں سائیں۔"

"نہیں، تم مجھ سے چھپا رہی ہو، جس کا مطلب ہے، تم مجھے غیر سمجھتی ہو۔"

سکھو نے اس کی آنکھوں میں لحظہ بھر کو دیکھا ——— اور پھر کہا۔

"تم نے بھی تو ابھی تک اپنائیت کا کوئی ثبوت نہیں دیا۔ مجھے کیا خبر تم غیر یا اپنے ———"

علی سن ہو گیا۔

سکھو نے ٹھیک کہا تھا۔ لیکن سکھو اس کے منہ سے کیا کہلوانا چاہتی تھی۔ اس اعلیٰ کو اندازہ نہ ہو سکا۔ وہ ایک کش مکش میں مبتلا ہو گیا۔ اسے اس کے جواب میں کیا کہنا چاہیئے۔

بالآخر تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔

"آج تمہارے ہاں ایک جوان آیا ہوا تھا ——— وہ کون تھا ———؟"

"وہ لال خاں تھا۔"

"لال خاں کون ہے ———؟"

"ہے تو ہمارے قبیلے کا، لیکن ———"

"لیکن کیا ———؟"

"میرا منگیتر بھی ہے۔"

"اچھا ——— اچھا ———" علی کو بیک وقت دو مختلف قسم کے تاثرات کا تجربہ ہوا۔ ایسے لگا جیسے اس کے ضمیر کا بوجھ اُتر گیا ہو۔ مگر یہ احساس بھی ہوا جیسے اس کے دل کو رنج پہنچا ہو ———

"پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہیئے۔ آج تمہارا منگیتر آیا ہوا تھا۔"

"مگر میں خوش نہیں ہو سکتی علی سائیں ———"

"کیوں ———؟"

"مجھے لال خاں پسند نہیں ہے ——"

علی پھر اُس کا ضمیر بوجھ ڈالنے لگا۔ ایک خطرہ سا سر اٹھانے لگا۔

"اتنا کڑیل، گبرو جوان ہے وہ، تمہیں پسند کیوں نہیں؟"

"مرد کے لئے صرف گبرو ہونا ہی تو شرط نہیں۔"

"تو اور کیا چاہیئے تمہیں ——؟"

"تم نہیں سمجھ سکو گے علی سائیں ——" سکھو نے منہ پھیر لیا اور اس کی طرف بیٹھ پھیر کر بیٹھ گئی۔

علی سگریٹ سلگا کے پینے لگا۔ اچھا ہوا سکھو نے اسے بتا دیا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ اچھا ہوا —— خاردار لوہے کی تار آپ ہی آپ بیچ میں آ گئی...

"علی سائیں۔ تم مجھے بُری لڑکی نہ سمجھنا ——" وہ منہ موڑے موڑے بولی "میں بُری لڑکی نہیں ہوں —— میں لال خاں کو شروع دن سے ناپسند کرتی ہوں اُس کی ایک وجہ ہے —— ایک مرتبہ لال خاں مخالف قبیلے کی ایک نوجوان لڑکی کو بھگا کر لے گیا تھا۔"

"اچھا ——"

"پھر قبیلے والوں نے اس کا سُراغ لگا لیا۔"

"بڑی حیرت کی بات ہے۔" علی بولا۔ "اتنا بڑا صحرا ہے اور کئی سو راستے اِدھر اُدھر نکلتے ہیں۔ انہوں نے کیسے سراغ لگا لیا؟"

"پتہ ہے یہاں لوگ اونٹ کے قدموں کے نشانوں سے مفرور اور چور کا سراغ لگاتے ہیں۔ ریت پر ہر قسم کے نشانات کئی کئی دنوں تک رہ جاتے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا ——؟"

"اس بیچاری لڑکی کو تو اُس کے بھائیوں نے گولی مار دی اور لال خاں نے قبیلے والوں سے معافی مانگ لی۔ اس کے بعد میرا رشتہ اس کے ساتھ طے کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ وٹہ سٹہ نہیں مانگ رہا تھا اور بھی اس کی کوئی شرط نہیں تھی۔"

پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہیئے سکھو۔ تمہاری زندگی میں زمینو جیسا اندیشہ نہیں ہوگا۔"

"ہاں۔ علی سائیں ——" سکھو نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ "میں خوش نہیں ہوں۔ میں لال خاں کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔"

"کیوں بھلا؟"

"دیکھو نا سائیں۔ عشق کی ریت تو یہی ہے کہ آدمی آخری دم تک نبھائے۔ لال خاں بختو سے عشق کرتا تھا۔ لیکن جب اُس کے بھائیوں نے بختو کو گولی ماری تو یہ چھپ گیا۔ اس کو چاہیئے تھا یہ بھی سامنے آ کر سینے پہ گولی کھاتا... اور اس کے ساتھ دفن ہوتا... اب.... اب.... زندگی بھر یہ مجھ سے جھوٹی محبت جتاتا رہے گا۔ مجھ پہ مرتا رہے گا۔ اور مجھے ایک بدعہد اور جھوٹے آدمی کا کہاں اعتبار آئے گا۔ ایسے جینے سے بہتر نہیں کہ میں مر جاؤں۔" علی کا دِل اندر سے ہل گیا۔

عورت کا فلسفہ کتنا گہرا ہے۔ وہ ایک ہرجائی مرد پر اپنی انمول جوانی اور لازوال محبت نہیں لٹانا چاہتی۔ عورت کیا جانے کہ یہ ازل سے ہرجائی ہے۔ ابد تک ہرجائی رہے گا۔

"علی سائیں۔۔۔ میں نے ہمیشہ سوچا ہے ——" وہ جیسے خواب میں بڑ گئی۔۔۔ جیسے کوئی آئے گا اور مجھے بچا لے گا۔ اس آدمی سے چھڑا لے گا۔ نجات کا راستہ بتائے گا۔۔۔ جانے کیوں۔۔۔ جانے کیوں۔۔۔ میں نے صحرا کے ان ننگے عریاں راستوں پر۔۔۔ کسی ابابیلے کا انتظار کیا ہے —— ہمیشہ راہ دیکھی ہے، اس صبح کی، اس شام کی —— بھلا میں کرشمے کی منتظر کیوں ہوں

سکھو کی آواز ڈوب گئی —— دور چلی گئی —— سکھو ایسی پہیلی بن گئی جسے وہ عرصہ دراز سے ملک ملک پھر کر حل کرتا پھر رہا تھا ——

علی کو خوف آنے لگا —— سکھو سے —— اپنے آپ سے۔

عورت کے اندر ایک جیسا دل ہوتا ہے —— وہ کوہستانی عورت ہو یا شہروں کی یا ریگستانی صحراؤں کی۔ بے لوث محبت مانگتی ہے۔۔۔۔

"اچھا سکھو، میں تمہیں بچا لوں تو کیا انعام دو گی ——؟" ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کے لئے علی نے شوخی سے کہا۔

"تم سائیں ——" سکھو ایک دم مڑی۔ اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"تم مجھے بچاؤ گے۔" وہ غیر یقینی انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"ہاں —— اگر میں بچا لوں تو مجھے کیا انعام دو گی؟"

"ہاتے سائیں، میں تمہارے قدموں پر اپنی زندگی وار دوں گی۔" سکھو نے جذب میں ڈوب کر کہا۔

"پگلی —— مجھے تمہاری زندگی کی نہیں، خوشی کی ضرورت ہے۔"

"اچھے آدمی پر زندگی وار دینے سے بھی خوشی ہی ہوتی ہے۔"

"اچھا اگر میں تمہیں شہر لے جاؤں ——؟"

"واقعی —— تم مجھے شہر لے جاؤ گے؟" وہ اور حیران ہوئی۔ "مگر کس طرح؟"

"میں تمہارے بابا سے اجازت مانگ لوں گا۔"

"مانگ لو گے —— بھلا کیسے ——؟"

"بھئی میں اُن سے اجازت لے لوں گا کہ سکھو کو میرے ساتھ شہر بھیج دیں۔ اس کا یہاں کیا کام ہے؟"

"سچ ——؟"

"ہاں ——!"

"اور شہر لے جا کر میرا کیا کرو گے ——؟" سکھو کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

"وہاں۔۔۔ وہاں۔۔۔ میں تمہارا بیاہ کر دوں گا ——"

"سچ ——" یہ کہہ کر وہ خود شرمندہ ہو گئی۔

پھر بولی۔

"لیکن بیاہ کس کے ساتھ کرو گے ——— ؟" اس وقت سکھو کی روح اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔

"بھئی تمہارے پنوں سے ——— اور کس سے ———"

"سچ ———"

اور سکھو جھٹ پٹخریں بجھاتی ہوئی دُور بھاگ گئی۔

جب وہ واپس آئی تو اُس کی جھولی میں کچھ جنگلی پھول تھے۔

وہ سارے پھول اُس نے علی کے سر پر ڈال دیئے۔

تھوڑی ہی دیر میں سکھو کا موڈ بدل گیا تھا۔ وہ بھی لڑکی ایک دم جل اٹھی تھی اس میں سے ایک تپش اُٹھ رہی تھی۔ اس کے بدن کے سارے زیور بولنے لگے تھے۔

اور علی سوچ رہا تھا۔

پتہ نہیں اس نے اچھا کیا ہے یا بُرا

لیکن اسے وہ مغموم اور افسردہ سی سکھو ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اسی دم سے تو اس ویرانے میں بہار تھی۔

تھوڑی دیر بعد سکھو بولی ———

"اگر بابا نے اجازت نہ دی تو ———"

"تو ———" علی سوچتے ہوئے بولا ——— "میں تمہیں اغوا کر کے لے

ڈں گا۔"

"پاگل۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ "مجھے گولی مروانا چاہتے ہو۔"

"نہیں کچھ ایسا طریقہ اختیار کریں گے کہ یہ ہمارا کھوج نہ لگا سکیں گے۔"

"ہے ایک ایسا طریقہ ———" وہ شرارت سے بولی۔

"مجھے بھی بتاؤ ———"

"ہوشیار آدمی اپنے اونٹوں کے پاؤں پر موٹا سا کپڑا باندھ دیتے ہیں۔ اس طرح صحیح نشان نہیں بن پاتے ———"

"ہاں یہ ترکیب ٹھیک ہے۔ مگر میرے پاس تو جیپ ہے۔"

"اس لئے تم جلدی پکڑے جاؤ گے۔"

دونوں قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ . . . سکھو جان گئی تھی کہ علی اُس کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر ہنس چکنے کے بعد بولی۔

"شہری لوگ "کوڑے" (جھوٹے) ہوتے ہیں۔"

"تمہیں کس نے بتایا ہے ——— ؟"

"کس نے بتانا تھا ——— جو ایک بار آتا ہے۔ دوبارہ کبھی نہیں آتا۔"

"میں دوبارہ آؤں گا۔"

"جھوٹ ———"

"سچ ———"

"وعدہ ـــــ"

وعدہ ـــــ!!"

علی نے اس کا ہاتھ ـــــ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں تھام لیا۔

علی جب اپنے گوپے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ تو منبردار اچانک اس کے "گوپے" میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھ علی احتراماً کھڑا ہو گیا۔

"تشریف رکھیں سائیں" منبردار نے مہذب انداز سے کہا۔ اور خود بھی اس کے پلنگ پر ایک طرف بیٹھ گیا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں آپ کو یہاں ـــــ؟"

"جی بالکل نہیں" علی نے عاجزی سے کہا۔ "میں اس طرح رہ رہا ہوں، جیسے کوئی اپنے گھر میں رہتا ہے"

"اللہ پردے رکھنے والا ہے ـــــ" اس نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر بولا۔

"میں کچھ دنوں کے لئے گھر سے باہر جا رہا ہوں"

"خیریت ـــــ" علی نے ٹوکا۔

"میری ہمشیرہ بیمار تھی۔ اور آج قضائے الٰہی سے فوت ہو گئی ہے۔"

"اناللہ۔۔۔۔" علی نے سنجیدہ سی شکل بنالی۔ "بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔"

"علی سائیں، مجھے آج ابھی اپنی بہن کے گاؤں جانا ہے۔ رسم و رواج کے مطا
مجھے وہاں دو تین ہفتے لگ جائیں گے۔ اگر ایسی مجبوری نہ ہوتی تو میں کبھی نہ جاتا۔ اللہ
اور اس کی ماں میرے ساتھ ہی جا رہے ہیں۔ البتہ زینو اور سکھو کو یہیں چھو
جا رہا ہوں۔ یہ دونوں آپ کا خیال رکھیں گی۔"

"جی آپ میرا بالکل فکر نہ کریں۔ اگر زینو اور سکھو کو لے جانا ضروری ہو تو انہیں
بھی لے جائیں۔ میں اب اس علاقے سے خوب واقف ہو گیا ہوں۔ اور پھر ایک
ہفتہ باقی ہے۔ میرا تقریباً تمام کام مکمل ہو چکا ہے۔ ہفتے بعد انشاءاللہ میں
جاؤں گا۔ میری وجہ سے آپ۔۔۔۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ علی سائیں ـــــ ایسے موقعوں پر ہم بچیوں کو نہیں
جاتے۔ ویسے بھی وہاں زینو کے سسرال والے آتے ہوں گے۔ کسی بدمزگی
کے اندیشے کے تحت میں اُسے نہیں لے جانا چاہتا۔ رہ گئی سکھو تو وہ ذرا
ہوشیار ہے ـــــ ایک دو بار آپ کے ساتھ جا چکی ہے۔ آپ کی اچھی سنبھا
کر دے گی۔ آپ جہاں بھی جانا چاہیں۔ سکھو کو ساتھ لے کر جا سکتے ہیں۔"

"آپ کی بڑی نوازش ہے بابا ـــــ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔۔ سکھو میرے
ساتھ نہ جائے تو بہتر ہے۔"

"کیوں سائیں کیا بات ہے ـــــ؟" نمبردار ایک دم چونک گیا۔ بلکہ ڈر گیا۔
کیا وہ آپ کے ساتھ گستاخی یا بدتمیزی سے پیش آتی ہے۔"

"نہیں بابا ـــــ سکھو تو بڑی مہذب اور بڑی اچھی لڑکی ہے۔ بلکہ جس دن
میں اُس کے ساتھ جاتا ہوں۔ مجھے زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بابا آپ کو
معلوم ہے۔ سکھو بے شمار علاقائی کہانیاں جانتی ہے۔ اسے بہت سی جگہوں
کا پتہ ہے اور ہر جگہ کے بارے میں وہ مجھے دلچسپ باتیں بتاتی ہے۔"

نمبردار ہنسنے لگا۔

سکھو بچپن سے بڑی باتونی ہے۔ اسے بچپن سے ہی کہانیاں سننے کا بڑا
شوق تھا۔ لوگوں سے کرید کرید کر پوچھا کرتی تھی۔ اب پتہ نہیں کیا سچ جھوٹ آپ
کو بتاتی ہو گی۔"

"نہیں بابا۔ سکھو کا علم بالکل صحیح ہے۔ دیکھیں تو میں نے لکھ لکھ کر اپنی
کتابیں بھرلی ہیں۔"

"تو پھر ـــــ آپ کو اُسے ساتھ رکھنے پر اعتراض کیوں ہے؟"

"بابا" علی نے سر جھکا کر کہا۔ دراصل آپ یہاں کے نمبردار ہیں۔ آپ کی بھی
کچھ روایات ہونگی ہیں نہیں چاہتا کہ سکھو کو میرے ساتھ دیکھ کر لوگ کسی قسم کا
اعتراض کریں۔ یا ایسی بات کہیں جس سے آپ کو ذہنی کوفت ہو۔"

"نہیں بیٹا، میرا سائیں ـــــ ایسا نہیں ہو گا۔" نمبردار کھڑا ہو گیا۔ ہمیں

اپنی بیٹیوں پر مکمل بھروسہ ہے۔ ان کی پرورش مویشیوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لئے ہماری لڑکیاں جتنی نڈر ہوتی ہیں۔ اتنی ہی بہادر بھی ہوتی ہیں۔ مویشی اچھے بُرے کی تمیز رکھتے ہیں نا؟ اُن کو بھی پتہ ہے کہ رات کو اپنے تھان پر واپس آنا ہے۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

"بس مجھے تو قلعہ مروٹ کی فلم بنانا ہے۔ اور اب یہاں کی دستکاری و صنعت کو دیکھنا ہے ـــــ" علی نے کہا۔

"یہاں دستکاری و صنعت زیادہ تر گھروں میں ہوتی ہے اور سکھو ان سب گھروں سے واقف ہے۔ آپ کو بہ آسانی لے جائے گی۔"

نمبردار نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"بے حد شکریہ بابا ـــــ میں آپ لوگوں کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اور جب بھی صحرا میں آؤں گا، آپ کا مہمان بننے میں فخر محسوس کروں گا۔"

"جیو میرا سائیں۔" یہ کہہ کر نمبردار نے جھک کر اُس سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل گیا۔

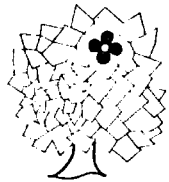

"علی سائیں۔ سارا وقت لکھتے ہی رہو گے۔ یا کوئی بات بھی کرو گے۔" بالآخر سکھو نے تنگ آکر ایک ڈھیلہ اُس کی طرف پھینکا جو سیدھا اس کی فائل پر جا کر لگا۔

علی نے سر اٹھا کر سکھو کی طرف دیکھا۔

وہ ایک گنجلک سی جھاڑی کے اوپر بیٹھی ہوئی تھی اور دو تین ڈھیلے اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔

علی نے دوبارہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

ایک بج رہا تھا اور وہ دس بجے سے لکھ رہا تھا۔

صبح نو بجے وہ قلعہ مروٹ میں پہنچ گئے تھے۔ قلعہ مروٹ کے بارے میں اس نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ بعض مؤرخین کا خیال تھا کہ یہ قلعہ امرکوٹ ہے۔ جہاں کسی زمانے میں اکبر بادشاہ آکر ٹھہرا کرتا تھا۔ قلعہ شہنشاہوں کے جاہ و جلال کا بیّن مظہر تھا۔ اور علی نے اسے دیکھ کر سوچا تھا۔ کیسے جیالے ہوتے تھے۔ اگلے

وقتوں کے بادشاہ ـــــ جہاں جاتے تھے۔ اپنے خوبصورت نقوش چھوڑ آ
تھے۔ یہ اللہ کی اتنی بڑی زمین، قرن ہا قرن سے پامال ہو رہی ہے ـــــ بسا
جا رہی ہے۔ مٹائی جا رہی ہے، اس زمین کے سینے میں لکھوکھا کہانیاں دفن ہیں ـــــ
پرانے درخت سینکڑوں واقعات سے لدے ہوتے ہیں۔ یہ آسمان پورا
فوٹو گرافر ہے۔ اس پہ بجلی فلیش گن کی صورت چمکتی ہے۔ اس آسمان کی آنکھ
کی پتلی میں صدہا مناظر محفوظ ہیں۔

یہ دنیا کیا ہے خدایا ـــــ؟

اتنی پرانی، اتنی البیلی اور اتنی ہی نئی ـــــ؟

ہر نسل کے لئے ہر بار یہ نئی ہو جاتی ہے۔ نئی اور خوبصورت نظر آتی ہے۔
جنگیں اس کو ہر صدی میں بدصورت بنا دیتی ہیں ـــــ یہ پھر بدلتی رت کے ساتھ
اپنا چہرہ بدل کر سامنے آ جاتی ہے۔

مگر اس دھرتی پر پرانے نشانات ہمیشہ رہ جاتے ہیں۔ جس طرح بچپن کے
پھوڑے کا داغ کبھی نہیں جاتا۔

علی یہاں آ کے فلسفی بن گیا تھا۔

تنہائی اور ویرانے میں سوچنے کا بہت موقع ملتا ہے نا؟ اور پھر شہری زندگی
میں بے شمار دوست، دشمن ہوتے ہیں، ہمیں محبتوں کی زنجیر میں یوں مصروف
رکھتے ہیں کہ ہم لحظہ بھر کو اپنے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتے ـــــ یہاں آ کر وہ

سلسل سوچ رہا تھا۔

اور پھر جب اُس نے ریگستان میں قدم رکھا تھا تو اسے ایسے محسوس ہو رہا
تھا، یہ ریگستان اس کی پہلی دریافت ہے ـــــ وہ اس ریگستان کا کولمبس
ہے۔ مگر یہاں آ کر دیکھا۔ تو بے شمار نقش ہائے قدم تھے ـــــ تاریخ اپنے
نشان چھوڑ گئی تھی۔

زمانہ بھی یہاں سے گزرا تھا۔

یہاں انسان بستے تھے ـــــ

جو خوبصورت تھے ـــــ خوش اخلاق و خوش رو تھے۔ دل رکھتے تھے۔
دل میں جذبات و احساسات رکھتے تھے۔

اور پھر یکایک اُس کا خیال جھاڑی میں پھنسی ہوئی سکھو کی طرف مبذول ہو گیا۔

صبح فو بجے وہ سکھو کے ساتھ اونٹنی پر بیٹھ کر یہاں پہنچا تھا ـــــ
قلعے کے اندر باہر گھوم کر اس نے بیشمار فلمیں بنائی تھیں ..... اور اس قلعے
نے یکایک اسے تحریک دی اور وہ سکھو کو سمجھا کر ایک طرف لکھنے کو بیٹھ گیا۔

"دیکھو سکھو۔ مجھے کچھ ضروری چیزیں لکھنا ہیں۔ اگر اس وقت نہ لکھیں تو
میں بھول جاؤں گا۔ تو مجھے بس ایک گھنٹہ دے دے۔"

"اچھا ـــــ" سکھو تنکا چباتی ہوئی دور ہٹ گئی۔ پھر اس نے اپنی اونٹنی
کو ہنکا کر ایک طرف بھیج دیا۔

علی لکھنے میں محو ہو گیا۔

ابھی ڈھیلا مار کر سکھو نے اس کا استغراق توڑ دیا تھا۔

"تو اتنی دیر سے کہاں تھی سکھو!"

"واہ سائیں واہ ——— میں تو اس وقت سے یہاں بیٹھی تمہیں دیکھ رہی اور تم پوچھتے ہو۔ میں کہاں تھی۔ شہری لوگوں کی نظر کیوں کمزور ہوتی ہے ——— سکھو چھلانگ لگا کر نیچے اتر آئی۔

علی نے اپنا پین بند کر کے فائل میں لگایا۔ پھر فائل کو بند کر ایک طرف رکھ دیا۔

"سکھو۔ ان کی نظر نہیں ——— دل کمزور ہوتا ہے"۔

"چھی چھی ———" سکھو ہنسی۔ "سبھی مردوں کے دل کمزور ہوتے ہیں"۔

"اچھا بتا ——— آج میرے لئے کیا پکا کر لائی ہے"۔

سائیں۔ آج میں تمہارے لئے ایک خاص چیز پکا کر لائی ہوں"۔ وہ کھا۔ والی گٹھڑی کھولنے لگی۔

"تو تو روز ہی کوئی خاص چیز پکا کر لاتی ہے۔ ابھی خاص چیزیں ختم نہیں ہوئیں"

"وہ جو بڑا پیارا مہمان ہوتا ہے نا؟ اس کو ہم یہ چیزیں کھلاتے ہیں ———" اُس نے رکابی ڈھکن اتار کر اس کے آگے کر دی۔

علی ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ۔۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا ہے سکھو؟"

"واہ" سکھو ہنسنے لگی ——— "تم تو ڈر رہے ہو"۔

"نہیں ڈر تو نہیں رہا ——— مگر تم بتاؤ اس رکابی میں کیا ہے ———"

"تمہیں کیا نظر آ رہا ہے سائیں ———؟"

"مجھے ——— تم نے ابھی تو کہا تھا شہریوں کی نظر کمزور ہوتی ہے"۔

"پھر بھی ذرا غور سے دیکھ کر بتاؤ یہ کیا ہے ———"

"یہ تو کیڑے پکے ہوئے ہیں ——— لاحول ولا ———" اُس نے منہ پھیر لیا۔

"علی سائیں یہ کیڑے نہیں ہیں۔ یہ تو یہاں کا خاص "کھاجا" ہے"۔

"مگر ہے کیا ———؟"

"یہ ٹڈیاں ہیں ———"

"ٹڈیاں ———!" علی زور سے چیخا ——— "یعنی اب تم مجھے مکروہ ٹڈیاں کھلانا چاہتی ہو؟" علی کو ابکائی آ گئی۔

انڈونیشیا، ملائشیا اور ہانگ کانگ میں اس نے چینی ریستورانوں میں عجیب و غریب چیزیں پکی ہوئی دیکھی تھیں۔ جھینگر، مینڈک، جھینگے، کچھوے ——— ایسے ریستورانوں کو وہ دور سے سلام کرتا تھا۔ اسے تو بس اپنے ملک کے چینی ریستورانوں کے کھانے ہی پسند تھے۔ کیونکہ وہ بالکل پاکستان کے مزاج کے مطابق تھے۔

اور اب یہ لڑکی ٹڈیاں پکا کر لے آئی تھی۔

"ڈرو نہیں ———" سکھو نے ہنس کر کہا۔ "یہ وہ ٹڈی نہیں جو شہر میں ہوتی ہے ——— تم نے مکڑی کا نام سنا ہے۔ مکڑی ———"

"وہ جو آسمانوں پر اڑتی ہے۔ جسے ٹڈی دل کہتے ہیں"۔

"ہاں ہاں وہی ـــــ جو فصلوں کو تباہ کرنے کے لئے آتی ہے ـــــ"

"وہ تو آفت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو اخباروں میں اس کو ختم کرنے کی م
چلائی جاتی ہے۔"

"جی ہاں آپ کے ہاں ہر کام اخبار میں ہوتا ہے۔ مگر ہم صحرائی لوگ اس ٹڈی
کو ایک نعمت سمجھتے ہیں۔ جب مکڑی آتی ہے تو مختلف طریقوں سے زیادہ سے
مکڑیاں پکڑ لیتے ہیں۔ پھر ان کو لہسن اور نمک لگا کر، کنستر کے کنستر بھر کے رکھ لیتے ہیں
خصوصی دعوتوں میں یہ مہمانوں کو پیش کی جاتی ہے۔"

"اور تم اسے صاف بھی نہیں کرتے ـــــ"

"اس میں صاف کرنے والا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو آسمانی شے ہے ـــــ البتہ
کی ٹانگیں اور پر خود ہی پڑے پڑے جھڑ جاتے ہیں ـــــ"

علی نے پھر غور سے رکابی میں دیکھا۔ مگر ہاتھ نہیں لگایا۔

"علی سائیں، چکھ کے تو دیکھو ـــــ"

"نہیں میں نہیں کھا سکتا۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ایک بار کھا کے تو دیکھو۔ پہلے پہل سب اجنبی ایسا ہی کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد
دوبارہ مانگتے ہیں۔"

"نہیں ـــــ میں دوبارہ نہیں مانگوں گا۔"

"اچھا میری خاطر تھوڑا سا چکھ لو۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"بھئی جو کچھ بھی میں دیکھ رہا ہوں۔ کھا نہیں سکتا۔ دیکھو نا؟ یہ تو ثابت کی ثابت

ڑی ہے۔ آنکھیں بھی اسی طرح کھلی ہیں ـــــ نہیں نہیں ـــــ"

"اچھا تم آنکھیں بند کرو۔ میں تمہیں ایک مکڑی کھلاؤں گی۔"

"نہیں ـــــ"

"تمہیں میری قسم ـــــ"

علی مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنی قوتِ ارادی کو جمع کیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا
یال تھا اگر وہ نہیں کھا سکے گا تو تھوک دے گا۔

سکھو نے بڑی نفاست سے ایک نوالہ اس کے منہ میں رکھ دیا۔ ڈرتے ڈرتے
اُس نے چبایا ـــــ کھایا ـــــ اور پھر کھاتا ہی چلا گیا۔

ایک خستہ، لذیذ اور نمکین سی شے اس کے دانتوں تلے آئی تھی۔

اُس نے دوسرا نوالہ منہ میں ڈال دیا۔

پھر تیسرا ـــــ

اب کے علی نے آنکھیں کھول دیں۔

"بھئی تم مجھے مکڑی تو نہیں کھلا رہیں ـــــ"

"تو اور کیا کھلا رہی ہوں ـــــ"

علی نے نیچے دیکھا۔ آدھی رکابی خالی ہو گئی تھی۔

"تو اس کا مطلب ہے میں کھا رہا ہوں؟"

"یہی تو میں نے کہا تھا۔"

سکھو نے ایک اور نوالہ اُس کے منہ کی طرف بڑھایا۔

"بس اب میں خود کھالوں گا۔ تم خواہ مخواہ ہیرو بننے کی کوشش نہ کرو۔"

"واہ سائیں واہ" ـــــ سکھو ہنس پڑا گئی۔

کھانے کے بعد علی وہیں ریت پر دراز ہو گیا اور سگریٹ پینے لگا۔

قلعہ مروٹ ایک اونچے ٹیلے پر واقع تھا اور اس کے نیچے ایک دریا بہتا تھا۔ پر سے بہتے ہوئے دریا کا منظر بہت بھلا لگتا تھا۔ . . . .

علی جھک جھک کر اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

"علی سائیں نیچے دریا کے کنارے چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"کیوں وہاں کیا ہے ـــــ ؟"

"یہاں بھی تو تم بیٹھے لکھ ہی رہے ہو۔"

"تمہیں کیا پتہ، میں کیا لکھ رہا ہوں ؟"

"ہاں ہاں مجھے پتہ ہے کہ میری تقدیر نہیں لکھ رہے۔"

"ارے تمہاری نہیں تم سب لوگوں کی تقدیر لکھ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب ـــــ ؟"

تمہیں نہیں معلوم میں تمہارے دیس کے لئے کیا کیا لکھ رہا ہوں۔"

"بھلا ہمارے دیس کے بارے میں کیا لکھو گے تم ـــــ"

"دیکھو نا ؟ تم بھی تو انسان ہو تمہیں بھی تو مہذب دنیا کی ساری سہولتیں ملنی شہروں میں اس قدر پانی ہوتا ہے اور یہاں لوگ ایک ایک بوند کو ترس کر مر جاتے شہروں میں ہسپتال ہیں اسکول ہیں۔ تفریح گاہیں ہیں میں چاہتا ہوں آپ سب کو یہ سہولتیں میسر ہو

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت تمہارا کہنا مانتی ہے سائیں ـــــ"

"ارے نہیں پگلی! میرا کام ہے کہ کوئی بات حکومت کی توجہ میں لاؤں۔ لوگوں ہاؤں کہ یہ صحرا جس میں اتنے پیارے پیارے لوگ بستے ہیں اس برقی روشنی سے ں محروم ہیں۔ جو اب شہر کی زندگی بن چکی ہے۔ ہم اخبار نویسوں کا کام بتانا ہوتا ے۔ توجہ دلاتا ہوتا ہے ـــــ میں تو یہ کام بڑے خلوص اور لگن سے کر رہا ہوں۔"

"تو تمہارے خیال میں یہاں کیا ہو سکتا ہے ؟"

"یہاں پانی کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ ٹیوب ویل لگ سکتے ہیں۔ کنویں کھدوائے سکتے ہیں۔ سڑکیں بن سکتی ہیں۔ کھیتی باڑی کے لئے جدید طرز کے آلات مہیا کئے سکتے ہیں۔ نئی نسل کو پڑھانے کے لئے اسکول کھولے جا سکتے ہیں۔ گھر گھر بجلی پائی جا سکتی ہے۔"

"بس بس علی سائیں بس ـــــ اتنی باتیں سن کر تو میں بے ہوش ہو جاؤں گی مجھے علوم ہے یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ایک بیان چھپے گا اخبار میں۔"

"ہیں ـــــ ؟" علی نے سگریٹ دور پھینک دیا۔ "تمہیں یہ بات کس نے ئی ہے۔ یعنی تم نے یہ بات کیسے کہہ دی۔"

"میرا لالہ اور دوسرے زمیندار چوپال میں بیٹھ کے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ تو میں سن لیتی ہوں۔"

"اچھا تم دیکھنا۔ اس مرتبہ ضرور کچھ نہ کچھ ہوگا۔ میں نے ایسا زوردار فیچر لکھا ہے اور ایسی جان لیوا فلمیں بنائی ہیں کہ بس۔"

علی دُور افق پر دیکھنے لگا۔

"یہاں ایک نئی صبح طلوع ہو گی ـــــ بالکل نئی ـــــ"

سکھو حیرت سے اُس کا منہ دیکھنے لگی۔

"اور تمہیں یہ خوش خبری سنانے مَیں آؤں گا ـــــ"

"کیا کیا ـــــ" سکھو اچھل پڑی۔

"کچھ دنوں بعد میں تمہیں ایک بہت بڑی خوشی کی خبر سنانے آؤں گا!"

"کیسی خبر سائیں ـــــ ؟" سکھو نے لال ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہے ایک خبر ـــــ ؟ اور تم اس خبر کو سُن کر ناچ اُٹھو گی جھوم جاؤ گی۔"

"سچی سائیں ـــــ"

"ہاں بالکل سچ ـــــ"

"پھر شادیانے بجیں گے۔ لوگ گائیں گے۔ ناچیں گے۔ تمہاری دھرتی منوں

لیکن سکھو نے آخری بات نہیں سنی۔

ایک البیلے احساس سے اُس کے مدھ بھرے نین چھلکنے لگے.... آپ ہی آپ

اُس کے منہ سے نغمے پھوٹ پڑے۔

"سکھو تم گانا بہت اچھا گاتی ہو۔ اگر تم شہر چلی چلو نا ؟"

"تو کیا ہو ـــــ ؟" وہ ایک دم بولی۔

"تو لوگ تمہاری آواز پہ مر مٹیں۔"

"بس شہروں میں لوگ مرنے کے لئے ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔ اسے کہتے ہیں۔

اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے۔"

"کافر ـــــ ؟ کون کافر ہے ـــــ ؟" سکھو معصومیت سے بولی۔

"بھئی تم مجھے اچھا سا گیت سناؤ ـــــ" علی نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔

"پہلے آؤ دریا کے کنارے چل کر بیٹھتے ہیں۔ پھر میں تمہیں ایک کہانی سناؤں گی۔"

"اچھا ابھی کوئی کہانی باقی ہے ؟"

"ہاں۔ شہزادی اور جرنیل کی کہانی ـــــ"

علی نے اپنی چیزیں اٹھائیں۔ اور سکھو نے کھانے والے جھوٹے برتن اٹھائے۔

وہ نیچے دریا کے کنارے آ گئے۔

"یہ یہاں کا اکلوتا دریا ہے۔ تمہیں پتہ ہے سائیں ـــــ" سکھو پانی میں پاؤں

لٹکا کر بیٹھ گئی۔

"اچھا وہ شہزادی اور جرنیل کی بات سناؤ۔"

"پرانے زمانے میں اس قلعے میں ایک شہزادی رہا کرتی تھی۔"

"شہزادیاں ہمیشہ قلعے میں ہی رہتی ہیں۔" علی بیچ میں بولا۔

"بڑی سُندر، بڑی نازک، بڑی حسین، بڑی البیلی ـــــ"

"ہاں شہزادیاں ہمیشہ خوبصورت بھی ہوتی ہیں ـــــ" وہ پھر بولا۔

"علی سائیں ـــــ اگر تم اس طرح بیچ میں بولو گے تو میں کہانی نہیں سناؤں گی۔"

"تم کیا سناؤ گی ؟ باقی کہانی میں بتاتا ہوں ـــــ"

"ایک سندر خوبصورت شہزادی نے ایک روز قلعے کی دیوار سے باہر جھا
کر دیکھا۔ تو اسے ایک اونچا لمبا باوقار، جیالا اور کڑیل جرنیل نظر آیا۔ دونوں کی نظ
ملیں۔ شہزادی کے دل میں درد اٹھا اور وہ جرنیل کی محبت میں گرفتار ہوگئی...
ہے نا ——؟"

"ہائے علی سائیں تمہیں کیسے پتہ ہے ——؟"

"میں اُن کے ساتھ تو نہیں تھا مگر مجھے پتہ ہے۔ دیواروں کے پیچھے رہنے وا
شہزادیوں کے ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ اور بھی تمہیں بتا سکتا ہوں۔
کہ وہ چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ عہد و پیمان کرتے تھے۔ ساتھ جینے ساتھ مرنے کی
قسمیں کھاتے تھے، گاتے تھے، ہنستے تھے۔"

سکھو کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔

"ہاں نہیں یہ تو نہیں معلوم نا کہ دونوں کی شادی نہیں ہو سکی تھی اور پھر دونو
اس دریا میں ڈوب کر مر گئے تھے۔"

علی نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ کافی دیر تک ہنستا رہا۔ "ہاں یہ پتہ نہیں تھا
اچھا کیا جو تم نے بتا دیا۔ ویسے اتنا مجھے پتہ تھا کہ ظالم سماج ان کے درمیان ضرور آئے گا۔"

"یہ ظالم سماج کیا ہوتا ہے ——؟"

"اچھا چھوڑو اس قصّے کو —— میں نے کہا ہے ایک اچھا سا گانا سناؤ۔ آج
میں اپنا ٹیپ ریکارڈر ساتھ لایا ہوں۔ آج تمہاری آواز ریکارڈ کر کے تمہیں سناؤں ——"

"ہائے میری آواز ——"

"ہاں ——"

"ابھی سُناؤ گے ——"

"ہاں ——"

"ہائے یہ بھی کوئی جادو کی پٹاری ہے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کہہ جو دیا ——"

"نہیں میں نہیں سُنتی۔ میری آواز لے کر تم چلے جاؤ گے اور پھر نہیں آؤ گے۔"

"ارے میں نے تم سے وعدہ جو کیا ہے کہ ضرور آؤں گا۔ اور تمہارے لئے
چنجری لاؤں گا۔ تمہاری آواز ساتھ لے جاؤں گا۔ یہ مجھے اپنا وعدہ یاد دلاتی رہے گی۔"

"اور اگر تم نہ آتے نہ علی سائیں، تو میں تم سے روٹھ جاؤں گی.... سُنا تم
نے ——"

"بھئی میں ضرور آؤں گا۔ کہو تو تمہارے سر کی قسم کھاؤں۔"

"نہیں، میرے سر کی قسم نہ کھاؤ ——" وہ ایک دم لال ہوگئی۔ "مجھے اعتبار
کیا ہے ——"

سکھو نے کھانے والی پراٹ نکال لی —— اور اپنی انگلیوں کے چھلّے اُس پر
بجا بجا کر پُرسوز آواز میں گانے لگی۔ علی نے اپنا ٹیپ ریکارڈر آن کر کے مائک کا
رخ اس کی طرف کر دیا۔

رُٹھے یار ڈاڈھے اوکھے منیدن منتاں کریدن زاراں کریدن
خواجے خضرو ے ڈیوے ملیدن ہتھ بدھ کھڑیدن.....

رُٹھے یار ڈاڈھے اوکھے منیدن

(روٹھ کر جانے والے محبوب کو منانا بہت مشکل ہے۔ ہزار ہا منتیں اور زاریاں کر
پڑتی ہیں۔ آس کے دیئے جلا کر۔ خواجہ خضر کے نام پہ دریا کی سطح پہ چھوڑ دیئے جا
ہیں (تاکہ راستہ بھولنے والے یا روٹھنے والے گھر آجائیں) ساری ساری رات ہاتھ
کے کھڑے رہتے ہیں۔ تب کہیں جا کر روٹھے ہوئے محبوب کو منایا جا سکتا ہے۔"

سکھو ڈوب کر اپنی دل سوز آواز میں گاتی رہی۔۔۔۔ گاتی رہی۔۔۔۔

علی گم صم سا بیٹھا رہا۔ اور گیت ختم ہو گیا۔

جب ٹیپ بند ہوئی تو علی کو ہوش آگیا۔ چونکا اور بولا۔

"سکھو تم نے مجھے اُداس کر دیا ہے۔ اتنا درد کیوں ہے تمہاری آواز

"آواز میں درد نہیں ہوتا سائیں، درد تو دل میں ہوتا ہے۔"

"واہ ——" علی نے چونک کر سکھو کی آنکھوں میں دیکھا۔

"بعض دفعہ حیرت ہوتی ہے —— صحرا میں پیدا ہونے والی لڑکی
طرح پتے کی بات کہہ دیتی ہے۔ کاش تو شہر میں ہوتی۔ اور تیرا ٹیلنٹ
ضائع نہ ہوتا ——"

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتی ——"

"اچھا چھوڑ —— تیری آواز سناؤں تجھے ——"

"میری آواز —— !"

"ہاں —— ہاں —— میں نے اس جادو کی ڈبیہ میں بند کر لی ہے۔"

"سچ ——!" سکھو اپنی جنگلی آنکھیں کھولے بیٹھی تھی۔ کہ علی نے
آن کر دیا —— آواز خوب بلند کر دی۔۔۔۔

سکھو کی ٹیپ شدہ آواز صحرا میں پھیل گئی۔ گونجنے لگی۔

"ہائے میں مر جانواں —— (ہائے میں مر جاؤں)"

کہہ کر سکھو کبھی کھڑی ہوتی کبھی بیٹھتی۔ اور کبھی ٹیپ ریکارڈ کے ساتھ کان
دیتی۔۔۔۔ عجیب تاثرات تھے اس کے چہرے کے، بوکھلاتی بوکھلاتی،
ت زدہ۔ مگر خوش بھی ——

اور علی کو اس کی صورت دیکھ کر مزہ آرہا تھا۔

ٹیپ ختم ہو گیا۔ مگر اس کا منہ ابھی تک کھلا تھا۔

"منہ بند کرو۔ اور اٹھو گھر چلیں۔"

"سائیں ایک دفعہ پھر سناؤ۔ مجھے تو یقین بھی نہیں آرہا۔"

"کیا یقین نہیں آرہا۔"

"کہ وہ میری آواز تھی۔"

"تو پھر وہ کس کی آواز تھی۔"

"ہائے اللہ —— وہ میری آواز تھی۔ سائیں اللہ کے واسطے ایک بار پھر سناؤ ——"

"نہیں ——" علی ٹیپ بند کرنے لگا —— "چار بج گئے ہیں۔ اب گھر کے لئے روانہ

ہوتے ہیں۔ گھر چل کر چلتے پیتیں گے۔ اس کے بعد میں تمہارے اور بہت سے گانے ٹیپ کر دا
"کیا کرو گے ——؟"
تمہاری آواز بھروں گا۔"
"اچھا اچھا ——" وہ خوشی خوشی کھڑی ہو گئی۔۔۔ "میں زینو کو بھی سنواؤں گی۔"
"ضرور سنوانا۔"

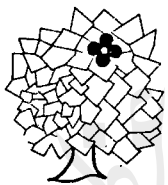

علی اپنے گوپے میں لیٹا، صبح کے ریکارڈ کئے ہوئے ٹیپ سُن رہا تھا۔ اُس نے آج سارا دن گھر پر گزارا تھا۔ سکھو اور زینو کے بہت سے گیت ٹیپ کئے تھے وران کی گفتگو ٹیپ کر کے انہیں سنائی تھی۔ طفیل آج جیپ لے کے کسی آدمی کے ساتھ شہر گیا تھا۔ ایک تو اسے فلم دیکھنے کا دورہ پڑا تھا۔ دوسرے علی کو کچھ ضروری خط پوسٹ کروانے تھے —— اللہ دسایا کو بھی شہر سے کچھ سودا منگوانا تھا اس لئے اس نے اپنا ایک مزارعہ بھی ساتھ بھیجد یا تھا اور اس وقت علی تنہا اپنے "گوپے" میں لیٹا تھا۔

علی یوں چونکا ——
جیسے اُس نے صورِ اسرافیل سُن لیا ہو۔
صحرا میں بادل کی گرج اور اس موسم میں ——

یہاں تو مون سون کا موسم پیاسا گزر جاتا ہے۔ دعائیں مانگ مانگ کر اور منّتیں کر کر کے لوگ بارش مانگتے ہیں۔

اور اب بادل گرج رہے تھے ——

یکایک یوں محسوس ہوا ہوائیں ٹھنڈی ہو گئی ہیں اور جھکڑ چلنا شروع ہو گیا اور پھر گھن گرج کے ساتھ مینہ برسنے لگا۔

صحرائی لوگ کس قدر خوش ہوں گے۔ اس نے دل میں سوچا۔

کاش دن ہوتا اور وہ اُن کی خوشی کو دیکھ سکتا۔

بارش بڑھتی گئی اور گوپے کی چھت پر گرتے ہوئے قطرے جلترنگ بجانے لگے۔ بجلی چمکی تو سارا گوپا روشن ہو گیا۔ علی ایک دم بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا دل چاہا وہ کا منظر دیکھے۔

دروازہ چھوٹا تھا۔ وہ اس میں سر جھکا کے کھڑا ہو گیا۔ اور دیکھنے لگا —— برس رہی تھی۔ ہوا اپنا زور منوا رہی تھی۔ اور تھوڑی دیر بعد بجلی چمکی اور بجلی چمکنے کا منظر کیسا روح فرسا تھا —— اسے پہلی بار احساس ہوا —— کھلے بیابان میں جہاں کوئی رکاوٹ نہ تھی —— بجلی اپنے پورے جوبن کے ساتھ چمکتی —— اور یوں محسوس ہوتا آگ کی ایک ناگن آسمان پر لہراتی ہے۔ بل کھاتی ہے —— اور پھر بل کھاتی ہوئی اپنی زبان سے زمین کا سینہ چاٹ کر اُٹھ جاتی ہے۔

لمحہ بھر کو ساری زمین آگ کا ایک طشت بن جاتی اور یوں لگتا تھا زمین کے نیچے ایک دیو کھڑا ہے جو آگ سے بھرے ہوئے اس طشت کو دونوں ہاتھوں سے ہلا رہا ہے۔ زمین باقاعدہ ہلتی ہوئی محسوس ہوتی۔

اُف وہ نظارہ جتنا ہیبت ناک تھا۔ اتنا ہی خوبصورت بھی تھا۔

علی کو اپنے گوپے میں ڈر آنے لگا —— فرض کرو۔ یونہی چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی بجلی اگر اُسے بھی چھو جاتے تو ——؟

اسے ایک جھرجھری آگئی اور دروازے سے پیچھے ہٹ گیا۔

اب کے بجلی چمکی تو اُسے بکریوں کے پاس ایک سایہ نظر آیا —— وہ چونک گیا۔ دوسری بار بجلی کے چمکنے کا انتظار کرنے لگا ——

سائے مویشی ابھی تک باہر ہی کھڑے تھے۔ شاید کوئی انھیں کھولنے آیا تھا۔

"کون ہے بھئی" علی نے بلند آواز سے کہا۔

جھانجھیں بج اٹھیں۔ اور کوئی تیز بارش میں اس کی طرف آنے لگا —— بجلی چمکی تو اُس نے دیکھا سکھو پانی میں شرابور بالکل اُس کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔

"سکھو یہ تم ہو ——"

"ہاں سائیں ——"

"اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ ذرا اور پیچھے ہٹ گیا۔ تاکہ اندر آ سکے۔

"میں بکریوں پہ تپڑ (کمبل) ڈالنے آئی تھی۔"

"اتنی بارش میں تمہارے موسیٰ باہر کھڑے رہتے ہیں؟"

"ہاں سائیں۔ ہمارے پاس اتنی جگہ نہیں کہ ان کو اندر باندھ سکیں۔ اور پھر کبھار تو بارش ہوتی ہے۔ بارش تو ہمارے لئے ایک نعمت ہے۔ انہیں اس نعمت سے کیوں محروم کریں۔"

سکھو اندر آ گئی تھی ——— بالکل علی کے قریب آ گئی تھی ———

"میں تو یہ دیکھنے آئی تھی علی سائیں، کہیں اس بجلی سے تم ڈر تو نہیں رہے۔"

اسی وقت زور سے کڑاکا ہوا ——— اور بجلی کی لپک ساری زمین کو ہلا کر کوندہ روشن کر گئی۔

اس روشنی کے کوندے میں آنکھیں پھاڑ کر علی نے سکھو کی طرف دیکھا۔ سکھو اس کے بالمقابل کھڑی تھی ——— اس کی پتلی چولی اس کے جسم کے ساتھ چپک گئی تھی ——— گھاگھرا ٹانگوں سے لپٹا ہوا تھا ——— چاندی کے زیور بھیگے ہوئے بالوں میں سے قطرے نکل رہے تھے۔ صبیح چہرہ بھیگا ہوا تھا ——— اور .... اور... جسم کے سارے خطوط واضح ہو رہے تھے۔

علی ایک دم لرز گیا ——— یک بیک اُسے احساس ہوا کہ یہ بجلی جو چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہے۔ اس آسمانی بجلی سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہے

ہم کر دینے والی ہے۔

آسمانی بجلی صرف زمین کو ہلا رہی تھی اور یہ بجلی اس کا تن من ہلا رہی تھی ——— سے تزلزل کر رہی تھی ——— اور اسے معلوم تھا، آج گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے۔ وہ ان کا مہمان ہے ——— اس کا باپ انہیں علی کی تحویل میں چھوڑ گیا ہے۔ اور دل کوئی تاویلیں نہیں مانتا ——— کسی تعزیر سے نہیں ڈرتا۔ دل وحشی ہے، جنگلی ہے ——— ناقابلِ اعتبار دوست ہے ———

علی ڈر گیا ——— اپنے آپ سے ڈر گیا۔

جلدی سے بولا ———

"سکھو تم اپنی چھوک میں چلی جاؤ ——— جاؤ ——— جاؤ ——— جلدی سے چلی جاؤ.... وہاں زینو اکیلی ہو گی۔"

سکھو نے ایک بھیگا بھیگا بہار یہ قہقہہ لگایا۔

"سائیں ——— ہم صحرائی لوگ بادل اور بجلی سے نہیں ڈرتے ——— یہ تو ہمارے ہمنشیں ہوتے ہیں۔"

"سکھو! میں جو کہہ رہا ہوں۔ تم چلی جاؤ ———" علی نے اس طرح ڈانٹ کر کہا کہ سکھو کو اپنی سبکی محسوس ہوئی۔ پھر بجلی چمکی تو اُس نے سکھو کی آنکھوں میں حیرت اور خفگی دیکھ لی تھی۔ مگر فوراً ہی منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

سکھو دھیرے دھیرے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اُس کی پائل کی آواز رفتہ رفتہ

بارش کی رم جھم کے ساتھ مل گئی۔

ہانپتا ہوا علی دھم سے اپنے بستر پہ گر گیا۔

مارسیلیز کے ساحلوں پر اُس نے بھڑکتی جوانیاں اور شعلہ سامان بدن دیکھے
سمندر کی لہروں کے اندر بھی اور باہر بھی ——

مگر اُف —— ایسا بھیگا حسن اُس نے آج پہلی بار دیکھا تھا —— کتنا
ہے معبود! اُس نے سوچا۔ کیسی کیسی مورتیاں بناتا ہے۔ اور کہاں کہاں مو
بناتا ہے —— ؟ اور کتنی فرصت سے مورتیاں بناتا ہے ——

اور جب حسن بے پرواہ بھی ہو —— بے نیاز بھی ہو۔ جلوہ آرا بھی ہ
تو دِل کو کہاں سنبھالا جا سکتا ہے۔

علی مرتضیٰ اپنے جذبات کے پُل صراط پہ کھڑا تھا —— ایک طرف جہنم تھا ا
طرف بہشت۔

کیتھی پلیز آؤ۔

آؤ —— اُس نے آنکھیں بند کر کے کراہتے ہوئے کہا۔

مجھے اس جہنم سے بچا لو ——

تلوار کی طرح تیز دھار راستہ ہے جس پر میں کھڑا ہوں۔

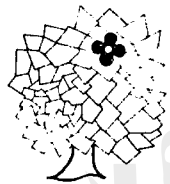

علی مرتضیٰ کے پاس باقی چار دن رہ گئے تھے۔ آج اس کو گاؤں کے اندر جانا تھا۔
کیونکہ وہ چولستان —— کی دست کاری اور صنعت کے نمونے دیکھنا چاہتا تھا۔
سکھونے اُسے بتایا تھا کہ یہاں باقاعدہ دست کاری کے اسکول یا کارخانے نہیں
ہیں۔ غریب اور بیوہ عورتیں اپنے گھروں ہی میں کام کرتی ہیں۔ اسی طرح غریب
آدمیوں نے اپنے گھروں میں کھڈیاں لگائی ہوتی ہیں۔ اور اونٹ کی کھال کے بٹوں
سے دھاگا بنا کر اس میں ریشم ملا کر ایک مخصوص کپڑا بنتے ہیں جسے یہاں مرد و زن
پسند کرتے ہیں اور پہنتے ہیں۔ عورتیں کھجور کے پتوں سے چٹائیاں، ٹوکریاں اور چنگیریں
بناتی ہیں۔

مگر علی نے کہا تھا وہ اُن کی زندگی کا یہ رُخ بھی دیکھے گا۔

اس لئے دونوں صبح نو بجے کے قریب گھر سے روانہ ہوتے۔ اب علی اونٹنی پر بیٹھا

کرتا تھا۔ اور سکھوا اپنے بھائی کے اونٹ پر ——— اور یہ بندوبست علی نے کیا تھا
اسے سکھو کے اتنے قریب بیٹھ کر ایک خوف آتا تھا۔ جس طرح نومولود بچوں میں سے
ایک آسمانی مہک آتی ہے اور انہیں بے اختیار چوم لینے کو دل چاہتا ہے۔ اسی طرح
کی ایک مہک سکھو کے وجود میں سے بھی اٹھتی تھی اور علی "بھرم" کا مطلب خوب
جانتا تھا۔

آگے آگے سکھو کا اونٹ تھا۔ اور پیچھے پیچھے علی کی اونٹنی۔ تھوڑی دور جا کر
علی نے سکھو کو آواز دی۔ وہ اپنا اونٹ اس کے برابر لے آئی۔

"سکھو ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی"۔ علی نے کہا۔

"میں صحرا میں جس طرف بھی جاتا ہوں۔ مجھے ریت پر انسانی پنجر کے مختلف حصے نظر
آتے ہیں۔ کہیں کوئی کھوپڑی پڑی ہوتی ہے کہیں بازو کی ہڈیاں کہیں ران کی ہڈی۔
یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا یہ وہ لوگ ہیں جنہیں جنگلی درندے پھاڑ کھاتے ہیں"۔

"ہاں سائیں ———" سکھو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "جنگلی درندے بھی کھا
سکتے ہیں۔ مگر ان میں سے زیادہ تر وہ بدقسمت لوگ ہیں جو پیاس کی وجہ سے دم
توڑ دیتے ہیں"۔

"واقعی ———؟" علی نے حیرت اور افسوس سے کہا۔

ہاں سائیں۔ ایسے واقعات ریگستان میں آئے دن ہوتے ہیں۔ کوئی مسافر
راستہ بھول جاتا ہے۔ یا پیاس سے بیکل ہو جاتا ہے تو جب اس کی جان لبوں

تی ہے نا؟ تو وہ اپنے کپڑے اتار کر ایک اونچی سی جھاڑی پر لٹکا دیتا ہے اور خود
یت پر لیٹ جاتا ہے ———"

"کیوں ———؟" علی نے جلدی سے پوچھا۔

"اس لیئے کہ اگر کوئی قافلہ کہیں آس پاس سے گزر رہا ہو۔ یا کوئی شخص اونٹ
پر جا رہا ہو تو اس کے کپڑے دیکھ کر ادھر چلا آئے ——— یہ کپڑے اس بات کی
علامت ہوتے ہیں کہ کوئی شخص پیاس سے دم توڑ رہا ہے"۔

"تو کیا اس طرح لوگ وہاں پہنچ جاتے ہیں ———" علی سر سے لے کر
پاؤں تک تھرا گیا۔

"ہاں اکثر مددگار وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن کئی بدقسمت ان کے پہنچنے سے
پہلے ہی مر جاتے ہیں"۔

"اُف میرے خدا ——— کتنا بڑا ظلم ———" علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے
یسا واقعہ تو کبھی کبھار ہوتا ہو گا ———" اُس نے پوچھا۔

"گرمیوں میں اکثر ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ ہڈیاں جو راستوں
یں پھولوں کی طرح بکھری پڑی ہیں۔ انہیں بدنصیب لوگوں کی ہیں"۔

تھوڑی دیر پہلے علی کو ان ہڈیوں سے خوف آ رہا تھا۔ یکایک اسے ان ہڈیوں
سے عقیدت محسوس ہونے لگی ——— پیاس کے شہید ہیں۔ یا یہ حالات کی بھینٹ
ہیں۔ یہ پیارے لوگ۔ جو بڑی رضامندی سے موت کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں۔

فقط ایک قطرہ پانی کے لئے!

پانی ـــــ خداوندا پانی ـــــ

پانی جسے ہم کتنا حقیر جانتے ہیں۔ ہم کوکا کولا سوڈا اور جانے کیا کیا پیتے ہیں اور یہ جفاکش لوگ صرف صبر کے گھونٹ پیتے ہیں۔

علی چپ ہوگیا۔ گم صم ہوگیا ـــــ جانے کہاں ڈوب گیا۔

تب سکھو نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو بولی۔

"علی سائیں۔ جو لوگ راستہ بھول جاتے ہیں، وہ بھی اپنے کپڑے اتار کر ایک درخت پر لٹکا دیتے ہیں۔ یہ میں پیشگی بتا رہی ہوں اب جب تم آؤ۔ اور خدانخواستہ راستہ بھول جاؤ تو ـــــ"

علی نے مڑ کر سوگواری سے اس کی طرف دیکھا اور پھر زبردستی مسکرا دیا۔

"اب جب میں آؤں گا تو راستہ نہیں بھولوں گا۔"

"میرے بھولے سائیں.... ہر مرتبہ یہاں راستے بدل جاتے ہیں۔ جن کا کھوج صرف صحرائی لوگ لگا سکتے ہیں۔"

"اچھا پھر تو میرے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔"

"اگر رات پڑ جائے نا؟" سکھو نے اپنا ادنٹ آگے کر کے کہا۔ "تو قطب ستارے سے راستے کا تعین کرتے ہیں۔ یہاں پر عام طور پر لوگ مٹی سونگھ کر بھی راستے کا اندازہ لگاتے ہیں

"اچھا ـــــ کیا مختلف سمتوں کی مختلف باس ہوتی ہے؟"

"ہاں سائیں۔ ہر علاقے کی مٹی کی خوشبو مختلف ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے۔ تمہارے علاقے کی مٹی سب سے زیادہ خوشبودار ہوگی۔" اس نے شرارت سے کہا اور سکھو کی طرف دیکھا۔

سکھو شرما گئی۔ پھر بولی۔

"یہاں سے جا کے کبھی یاد بھی نہ کرو گے۔"

"تمہیں تو میں بہت یاد کروں گا سکھو ـــــ"

"وہ کیسے ـــــ؟"

"اتنی بے شمار تو تمہاری تصویریں لے جا رہا ہوں۔"

"بس ـــــ! تصویروں کی وجہ سے یاد رکھو گے؟" سکھو اداس ہوگئی۔

"نہیں تو نے میری اتنی تواضع کی ہے۔ اتنی بے شمار باتیں بتائی ہیں۔ تیرے گیت میرے پاس ہیں۔"

(کاش! تم پوچھو کہ یہ گیت میں نے کس کے لئے گائے ہیں۔ سکھو نے دل میں سوچا ـــــ)

اُسے کسی خیال نے آزردہ کر دیا۔ وہ خاموش ہوگئی۔ علی نے محسوس کیا۔ مگر اس نے بھی چپ رہنا مناسب سمجھا۔

اتنے میں آبادی کے نشان نظر آنے لگے۔ دُور سے ہی صحرانشینوں کے گنبد نما

"گوپے" اور "جھوکیں" نظر آنا شروع ہو گئیں ـــــ دُور سے یہ گھر بہت خوبصورت تھے۔ علی نے کیمرے کا لینس ٹھیک کیا۔ اور اونٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک تصویر۔ پھر سکھو نے ایک جانب اونٹ روک دیئے۔ دونوں اُتر پڑے جانوروں کو انہوں چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اور خود پیدل بستی کی جانب چلے۔

راہ میں اگر کوئی اکا دُکا راہ گیر ملتا تو انہیں ضرور سلام کرتا۔ علی نے دیکھا پاؤں سے ننگے ہوتے تھے۔

"کیا بات ہے یہ لوگ جوتے کیوں نہیں پہنتے؟"

"اِن میں سے اکثر کے پاس جوتے نہیں ہوتے" سکھو نے ہنس کر کہا۔

"مگر گرمیوں میں تو یہ ریت بہت گرم ہو جاتی ہو گی"

"ہاں سائیں ـــــ" وہ بولی۔ "ریت اتنی گرم ہو جاتی ہے۔ جتنا توا۔ پھر اس ریت پر باقاعدہ روٹی پک سکتی ہے"

"جھوٹ ـــــ!" علی ایک دم چیخا۔

"کاش گرمیوں کا موسم ہوتا تو میں تمہیں روٹی پکا کر کھلاتی"

"کتنے عظیم اور بہادر ہیں یہاں کے لوگ ـــــ" تھوڑی دیر بعد علی بڑ کے قابل ہوا ـــــ

"پتہ نہیں سائیں۔ تم کیا کہہ رہے ہو" اُس نے جھلا کر کہا۔

پھر ایک گھر کے آگے رُک گئی۔

"یہ زہرو ماتی کا گھر ہے۔ بیوہ عورت ہے۔ اور گڈریاں بنا کر گزر اوقات کرتی ہے" سکھو علی کو لے کر اس کے گھر کے اندر چلی گئی۔ اپنی زبان میں علی سے اس کا تعارف کرایا تو اس زہرو ماتی نے جلدی سے پلنگ پر کھیس بچھا کے علی کو بٹھایا۔ اور صندوق کھول کر بے شمار رنگ برنگی گڈریاں نکال کر لے آئی۔ ننھے منے فالتو ٹکڑے جوڑ کر اتنی خوبصورت گڈریاں بنی ہوئی تھیں کہ علی کی عقل دنگ رہ گئی۔

"ایک گڈری (رلی) بنانے میں کتنا عرصہ لگتا ہے؟"

"دو سال تو لگ ہی جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات پانچ سال بھی لگ جاتے ہیں"

"اور ان کی قیمت کیا ہے ـــــ؟"

"کسی کی سو روپیہ، کسی کی دو سو اور کسی کی چار سو ـــــ"

"بس ـــــ" علی چیخا ـــــ "کئی کئی سال لگا کے تم یہ چیزیں بناتی ہو۔ اور اتنی کم قیمت ـــــ"

"کیا کریں سائیں ـــــ" وہ بولی۔ "یہاں اُن کو بھی خریدنے والے نہیں ہوتے ہیں تو کوئی سیاح آ جائے تو ہماری عید ہو جاتی ہے ـــــ"

"یہ ساری گڈریاں (رلیاں) مجھے لپیٹ دو ـــــ" علی نے کہا۔

"علی سائیں کیا یہ تم ساری لے لو گے؟"

"ہاں ہاں ـــــ"

"مگر کیا کرو گے؟"

"وہاں شہر میں جاکر لوگوں کو دکھاؤں گا۔"

"مگر صرف دکھانے کے لئے تم اتنے پیسے خرچ کروگے؟"

سکھو منع کرتی رہ گئی۔ مگر اس نے ساری گڑیاں لے کر جب پیسے اس کی ہتھیلی پر رکھے تو اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب سی روشنی پھیل گئی۔ علی نے اپنے دل میں بسالی۔ وہاں سے سکھو سے ایک اور گھر میں لے گئی۔

"یہ چاچی کرموں کا گھر ہے۔ اس کا شوہر اندھا ہوگیا ہے۔ پہلے وہ کچھ پتوں سے چیزیں بناتا تھا اب اس کی بیوی بناتی ہے ——"

علی نے دیکھا بہت خوبصورت ٹوکریاں اور چٹائیاں تھیں۔ . . . اور چھوٹی پنکھیاں تو بے حد خوبصورت تھیں۔ جھالریں اور موتی لگا کر اس نے ان کو بڑی خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔ وہاں سے علی نے بیشمار چیزیں خریدیں۔

پھر وہ اسے کاکا رمضو کے گھر لے گئی۔ اُس نے کھڈیاں لگائی ہوئی تھیں تہبند اور کھیس بناتا تھا —— وہاں سے کچھ خوبصورت تہبند اور کھیس علی نے خریدے۔

باہر نکل کر سکھو نے کہا۔

"علی سائیں اگر تم ان کی غربت پر ترس کھا کر اسی طرح چیزیں خریدتے رہے تو تمہیں اپنی زندگی کی ساری پونجی یہیں لٹانی ہوگی ——"

"کاش میں ایسا کر سکوں سکھو —— تو یہ کتنا نیکی کا کام ہوگا!"

"میرا خیال ہے میں تمہیں سب گھروں میں نہ لے جاؤں تم ہر ایک کی خوشنودی کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور خریدو گے۔"

علی ہنسنے لگا۔

"سکھو مجھے یہ بتا . . . . تو اتنی چالاک کیسے ہوگئی ہے"

سکھو زور زور سے ہنسنے لگی۔

"زینو بھی مجھ سے یہی کہتی ہے۔ وہ کہتی ہے تو بڑی چالاک ہے۔"

"علی سائیں چالاک لوگ بُرے ہوتے ہیں۔"

"نہیں۔ اصل میں عقل مند لوگ چالاک کہتے ہیں۔"

"میں کیا خاک عقلمند ہوں گی۔ اب زینو مجھ سے روز کہتی ہے تو بے وقوف ہے۔"

"کیوں بھئی ——"

"بس علی سائیں . . . . . وہ . . . . ."

"بھئی بتا بھی چکو نا؟"

"وہ جس دن تم نے مجھے سسی کہا تھا نا —— ؟ اسی دن سے وہ مجھے برابر ٹوکتی رہتی ہے . . . . . اور کہتی ہے۔ سسی تو بے وقوف تھی، کہیں تو بھی بے وقوف نہ بن جانا ——"

"بھئی مجھے تو بھوک لگ رہی ہے" علی نے جلدی سے بات بدل لی۔ "آج تم کھانا بھی ساتھ نہیں لائیں۔ کیا کھلاؤ گی؟"

یہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے زرینہ ـــــ میں نے اسے اط
دی تھی۔ آج دوپہر کا کھانا ہم اس کے گھر کھائیں گے۔ وہ تنور پہ بہین کی
عمدہ روٹیاں لگاتی ہے۔ ساتھ مکھن اور چھاچھ بھی ہوگی ـــــ"
"اس کے ہاں چلیں۔"
"ضرور چلیں ـــــ" دونوں نے ایک ساتھ قدم اٹھائے۔

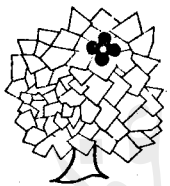

ریت کے چمکدار ذرّے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ اوپر کھلے اور
ہاں آسمان پہ چاند کا گول طشت اس طرح پڑا تھا۔ جس طرح سہاگ رات
ن نے اپنا جھومر اتار کے آئینے کے اوپر رکھ دیا ہو۔
علی کے پاؤں کے نیچے نرم نرم ریت پھسل رہی تھی اس کے ساتھ سکھو
ل رہی تھی۔ علی کچھ سوچ رہا تھا۔
سکھو کچھ اور سوچ رہی تھی ـــــ
علی سود و زیاں کے چکر میں الجھا ہوا تھا۔
سکھو دین و ایمان کی بات سوچ رہی تھی۔
علی عقل سے مشورہ مانگ رہا تھا۔
سکھو عشق کی سہیلی بن رہی تھی۔

اور علی کو غصّہ آنے لگا۔

بھلا وہ ہر بار سکھو کی بات کیوں مان جاتا ہے؟

آج وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ سارا دن طفیل کو ساتھ لگا کر اپنا سامان باند
رہا تھا ـــــ آج یہاں اُس کا آخری دن تھا ـــــ آخری رات تھی ـــــ
اس کا یہ دورہ بہت کامیاب اور بڑا خوشگوار رہا تھا ـــــ وہ اپنے کارنامے
جلد جا کر اپنے اخبار کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر نشر کرنا چاہتا
جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔

کہ سکھو اس کے دروازے پر نمودار ہوئی۔

سکھو آج بڑی سوگوار اور ذرا بڑی لگ رہی تھی۔

"کیا بات ہے سکھو ـــــ؟" چونکہ گوپے میں ڈرائیور بھی تھا۔ اس لـ
سکھو کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"سائیں تم کل چلے جاؤ گے نا؟"

"ہاں ـــــ!"

"پھر آؤ آج رات ریگستان کی سیر کریں۔"

"آج رات ـــــ یعنی اس وقت ـــــ" علی نے چیخ کر کہا۔

"ہاں آج رات ـــــ دیکھو کتنا خوبصورت چاند آسمان پر چمک رہا۔
آج چاند کی چودھویں ہے۔ آج سارا صحرا آئینے کی طرح نظر آ رہا ہوگا۔"

"میں نے تمہیں ہر جگہ کی سیر کرائی ہے۔ آج دل چاہتا ہے۔ تمہیں صحرا کی
رات دکھاؤں۔۔۔۔"

"مگر میرا تو ابھی کام۔۔۔۔"

"چھوڑو کام کو ـــــ" اُس نے اُداسی سے کہا۔ "ساری زندگی کام ہی کرنا
ہے آج میری خاطر آ جاؤ آخری بار سہی۔"

"اچھا ـــــ" علی نے رُکتے ہوئے کہا۔ "میں جیپ کی چابی لے آؤں۔"

"نہیں جیپ میں نہیں جائیں گے ـــــ پیدل جائیں گے اور ننگے
پاؤں جائیں گے ـــــ"

"اچھا ـــــ"

علی اندر گیا۔۔۔۔ اُس نے کرتا شلوار پہن لیا اور چپل باہر آ کر اتار دیئے۔ احتیاطاً
جیب میں ٹارچ پکڑ لی۔

"بھئی اس کی کیا ضرورت ہے۔" سکھو نے پوچھا۔

"ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔" وہ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"تمہارا خیال ہے علی سائیں، کہ یہ چاند بھی شہری بجلی کی طرح ہے۔ کیا خبر اچانک
چلا جائے۔"

"ہو سکتا ہے ـــــ"

"مگر یہ تو صحرا کا چاند ہے ـــــ ذرا دیکھو اس کی طرف ـــــ اس کے آس

پاس کوئی بدلی نہیں۔ یہ کسی اوٹ میں نہیں چھپتا۔ رات کو جوان ہوتا جاتا ہے ــــ
علی نے غور کیا تو اُسے صحرا کی چاندنی واقعی مختلف نظر آئی۔ اتنا روشن، اتنا بڑا چا
اس نے کہیں نہیں دیکھا تھا ــــ چاندنی زمین کے کونے کونے کو منور کر رہی تھی
ایسے لگ رہا تھا۔ آسمان پر پتہ نہیں کتنے لاکھ واٹ کا بلب روشن ہے ــــ ا
سکھو کا چہرہ اور زیور صاف نظر آ رہے تھے۔ ریت پر بنے ہوئے نشانات صاف
نظر آ رہے تھے ــــ چاندنی میں ٹھنڈک تھی۔ ریت میں خنکی تھی۔ ننگے پاؤں پر
نرم ریت بچے کی انگلیوں کی طرح گدگدی کرتی تھی۔ ننگے پاؤں چلنے میں اُسے مزہ آ
تھا ــــ وہ سوچنے لگا ایسی ہی چاندراتیں ہوں گی۔ جن کے بارے شاعر شعر
ہیں اور معتور تصویریں بناتے ہیں ــــ

چاند، تنہائی اور ویرانہ ــــ اور..... ماہ جبین ــــ

علی کا دل ایک خطرے کے احساس سے دھڑکنے لگا۔

"چلو سکھو واپس چلتے ہیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ دُور نکل جا
اور راستہ بھُول جائیں۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں اور مٹی سونگھ کر بتا سکتی ہوں کہ ہم کہاں ہیں ــــ

"چلو بیٹھ جائیں ــــ میں تھک گیا ہوں۔"

وہ دونوں بیٹھ گئے۔

ریت پر بیٹھتے ہی علی کو احساس ہوا کہ واقعی اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔

اپنے بازو کا تکیہ بنا کر زمین پر لیٹنے لگا۔

"ہائے یہ کیا کرتے ہو علی سائیں ــــ"

"بھئی لیٹ رہا ہوں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر لیٹنے سے مزہ آ رہا ہے۔"

"یہاں تو تکیہ بھی نہیں ہے۔"

"نہیں میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ یہاں بھی تو لوگ ریت پر ہی سوتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے علی سائیں یہاں ایک خطرناک قسم کا سانپ ہوتا ہے ــــ"

(تو کیا تم سے بھی خطرناک کوئی شے ہے؟ علی نے سوچا)

"ہاں تو کیا کرتا ہے وہ سانپ، خوبصورت لڑکیوں پر عاشق ہو جاتا ہے۔"

سکھو نے گھونگھروؤں جیسی ہنسی بجائی۔

"پتہ ہے سوتے میں آدمی کا سانس پی جاتا ہے ــــ"

"ہیں ــــ!" علی ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا کہا ــــ"

"سچ کہہ رہی ہوں۔ یہاں صحرا میں تھکے ہارے لوگ راستوں میں سو جاتے ہیں۔ ایک سانپ آتا ہے اور ان کے مُنہ پر منہ رکھ کے اُن کا سانس پی جاتا ہے ــــ صبح کو اس شخص کی لاش ملتی ہے۔"

"اوہو ــــ پھر یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"یہ عام طور پر رات کو سوتے وقت وصیت لکھا لیتے ہیں۔"

"وسل ـــــ وسل کیا ہوتا ہے ؟"

"بھئی وسل پیاز ہوتا ہے ـــــ پیاز ـــــ"

"اچھا ـــــ" علی بولا ـــــ "تو گویا سانپ کو پیاز کی خوشبو اچھی نہیں لگتی"

"شاید ایسا ہی ہے ـــــ"

"تم نے تو مجھے ڈرا دیا ہے ـــــ اب میں نہیں سوؤں گا" علی واقعی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ۔ سانپ عورتوں کی سانس پیتا ہے یا صرف مردوں کی ـــــ"

"اس کے لئے عورت مرد سب برابر ہیں"

"پھر وہ تمہارے نزدیک بھی تو آسکتا ہے۔ تم تو ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہو"

"تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کا خوف نہیں ہے۔ بس یہی احساس ہے کہ تم یہاں ہو۔ اس صحرا میں تم ہی تم نظر آرہے ہو۔ . . . ."

"فرض کرو اگر سانپ مجھے ڈس لے تو تم کیا کرو گی ؟"

سکھو تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر بولی

"سائیں تم نے صادق دوست دیکھے ہیں"

"صادق دوست ـــــ" کہاں رہتے ہیں وہ۔ اور کون ہیں ـــــ ؟"

"یہاں صحرا میں ایک مشہور پرندہ ہے۔ جسے آپ لوگ غالباً ہنس کہتے ہیں۔ دریا کے کنارے رہتا ہے ـــــ نر اور مادہ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں ایک

دوسرے سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ اگر ان میں سے ایک شکاری کی گولی کا نشانہ بن جائے ـــــ یا مر جائے تو دوسرا اُس کی لاش کے پاس بیٹھ کر اپنا سینہ اپنی لمبی چونچ سے زخمی کر لیتا ہے ـــــ اور سینے کا گوشت نوچ نوچ کے وہیں مر جاتا ہے۔ علاقے کے لوگ انہیں "صادق و دست" کہتے ہیں۔ صحرا میں تمہیں ہر جگہ صنوبروں پر ان کے نشان نظر آئیں گے ـــــ"

"ہاں ـــــ" علی کو یاد آگیا ـــــ بھاول پور میں بھی اُس نے یہ نشان پرانی عمارتوں پر اور سرکاری کاغذات پر دیکھے تھے۔ دو ہنس ایک دوسرے کے آمنے سامنے۔ چھاتی سے چھاتی ملا کر بیٹھے ہیں۔ تب اُس نے صرف اسے پرانے زمانے کا سرکاری نشان ہی سمجھا تھا۔

"تم چپ کیوں ہو گئے ـــــ ؟" سکھو نے پوچھا۔

علی کیا کہتا ـــــ ؟ کیا کہتا بھلا ـــــ ؟ اُسے اس پاگل سی لڑکی پر رحم آرہا تھا ـــــ یہ صحرا کے لوگ کتنے سچے اور کھرے ہوتے ہیں۔ ان میں ابھی متمدن شہروں کی ملاوٹ نہیں ہوئی۔ ریا اور تصنع سے پاک ـــــ عشق و محبت ہی کو حاصلِ حیات سمجھتے ہیں ـــــ

لیکن افسوس علی کو آنے میں اور کھوجنے میں دیر ہو گئی۔

علی کے دل کو عجیب سی تکلیف ہونے لگی ـــــ اس کا دل چاہا وہ یہاں سے بھاگ جائے ـــــ دوڑ جائے ـــــ مگر جلدی سے بولا ـــــ

"کوئی اچھا سا گیت سناؤ سکھو۔ تم نے مجھے اُداس کر دیا ہے ——
سکھو گویا منتظر تھی ——
اپنی بھیگی ہوئی اداس اور پُرسوز آواز میں گانے لگی۔

جانی رات رہ پوسانگا جندائی ہے
متاں وَل نہ ٹکروں جندڑی پرائی ہے

(اے میرے محبوب! آج کی رات ٹھہر جا۔ اللہ نے ہمیں اتفاق سے ملا دیا۔ تو تُو مجھے چھوڑ کے نہ جا۔ ممکن ہے پھر زندگی میں ہماری ملاقات نہ ہو۔ کیونکہ حیات فانی ہے۔)

گو علی کی سمجھ میں گیت کے بول نہیں آ رہے تھے، مگر اُس کا مفہوم ذہن میں بیٹھ جا رہا تھا۔ سکھو کی آواز میں اس رات ایک تڑپ تھی۔ ایک التجا تھی۔ ایک پکار تھی۔

گیت نے ماحول کو مزید بوجھل اور اداس کر دیا۔

"بھئی اب مجھے مطلب بھی تو سمجھاؤ اس گیت کا ——" علی نے گیت ختم ہوتے ہی جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

"اوہ علی سائیں۔ ایک مہینہ ہو گیا۔ آپ کو یہاں آئے اور ابھی تک آپ کو ہماری زبان ہی نہیں آئی؟"

"بھئی گیتوں میں تو آپ لوگ ذرا مشکل زبان استعمال کرتے ہیں۔"

"اس گیت میں تو ایک فریاد ہے، ایک التجا ہے۔" سکھو نے ذرا اُداس ہو

ہوئے کہا۔ "ایک مجبور سی لڑکی اپنے ڈھول کے آگے فریاد کرتی ہے .... ہمارے علاقے میں یہ گیت اس وقت گایا جاتا ہے۔ جب کسی کا محبوب رخصت ہونے لگتا ہے ——"

"سکھو گھر واپس چلیں ——" علی ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے —— اگر تمہارا لالہ آ گیا تو میرے بارے میں کیا سوچے گا ——؟"

"جس کا جو جی چاہے سوچے —— آج میرا واپس جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"نہیں سکھو چلو ——"

اُس نے سکھو کو زبردستی اٹھایا —— رات جوان ہوتی جا رہی تھی ....
چاند سے مستی چھلکنے لگی تھی، صحرا ایک سنہری پھول بنتا جا رہا تھا۔ یہ وہ مقام تھا۔ جہاں انسانی ہوش و حواس کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

علی کی یہ آخری رات تھی ——
اور وہ آخری رات کی بھینٹ نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔

"تمہارا لالہ اگر ہم دونوں کو اکٹھا دیکھ لے گا۔ تو بغیر سوچے سمجھے گولی مار دے گا۔"

سکھو چپ رہی۔

"بولو نا؟ میں نے ٹھیک کہا ہے۔"

"ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔"

"مگر میرا تو مرنے کو دل نہیں چاہتا ——"

سکھو سوگواری سے ہنس پڑی۔

"ہم صحرائی لوگ جان دینے کو عشق کی معراج کہتے ہیں۔"

"تم صحرائی لوگ نادان دوست ہو۔"

"ہم صحرائی لوگ "صادق دوست" ہیں۔"

"ارے وہ دیکھو سامنے ایک سایہ سا نظر آرہا ہے۔" علی نے کہا۔

سکھو نے غور کیا اور بولی ——— "ہاں کوئی اسی طرف آرہا ہے۔"

"اگر تمہارا لالہ ہوا تو ———" علی خوف زدہ ہو گیا۔ اور اپنی موت اُس کی نگاہوں کے آگے آگئی۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا باہر مت جاؤ ———"

وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم چلتے رہے۔ جوں جوں سایہ قریب آرہا تھا علی کا خون خشک ہو رہا تھا۔ اس بے وقوف لڑکی کا کہنا مان کر اس نے اپنی سارے ساکھ خراب کر لی ——— بس یہ ایک ہی تو رات تھی ———

اور قریب . . . . اور قریب ——— جب فاصلہ کم رہ گیا تو انہیں احساس ہوا۔ وہ کوئی عورت ہے۔ کیونکہ اس کے لہنگے کے گھیرے کے ساتھ کے پاؤں کے زیور بھی بج رہے تھے۔

علی کی جان میں جان آئی ——— سکھو نے اپنی علاقائی لے بنا کر زور سے ایک آواز نکالی ——— دوسری طرف سے بھی ویسی ہی آواز آئی، دونوں آوازوں کی گونج راہوں میں رہ گئی۔

تھوڑی دور آگے چل کر سکھو نے پھر ایک آواز نکالی اور بولی ——— "زینو کاکی" دوسری طرف سے ویسی ہی آواز آئی۔ تو سکھو نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور بولی۔ "کاکی زینو شاید ہمیں ڈھونڈتی ہوئی آرہی ہے۔"

"کہیں تمہارا بابا یا لالہ نہ آگیا ہو ———"

"ایسی بات نہیں ہوگی۔ زینو ویسے ہی ڈرپوک لڑکی ہے اس نے مجھے یہاں آنے سے روکا بھی تھا۔ کہہ رہی تھی پردیسیوں کا کیا اعتبار رات کا وقت ہے۔ اور ———"

"ہاں وہ ٹھیک کہتی تھی۔" علی نے سکون سے کہا۔

"رات کو کسی کے ساتھ تنہا نہیں جانا چاہیئے۔ لیکن تم "کسی" تو نہیں ہو سائیں۔"

"واقعی تم نے ایک خطرناک قدم اٹھایا تھا۔"

"سائیں میں نے تمہیں بتایا تھا۔ عشق خطروں سے نہیں ڈرتا۔"

زینو قریب آگئی تھی۔ اس لئے علی کو خاموش رہنے کا موقع مل گیا۔

وہ شاید اپنی زبان میں سکھو کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ صرف آواز کے اتار چڑھاؤ سے اُس نے یہ اندازہ لگایا۔

اور واقعی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اُن کے گھر سے آنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد اللہ دسایا آگیا تھا۔ اس کو معلوم تھا علی کو صبح جانا ہے۔ اس لئے وہ اُسے رخصت کرنے آیا تھا۔

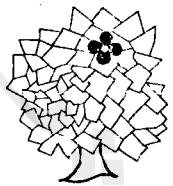

صبح کو گاؤں کے کئی لوگ اس سے ملنے آتے اور ہر شخص کوئی نہ کوئی تحفہ لاتا۔ چھابے، چنگیریں، لنگیاں، تہبند، کھیس، پگڑیاں، پنکھے اور ہاتھ سے بُنی ہوئی سٹولیاں علی اُن کا خلوص اور تحفے دیکھ کر دنگ ہوا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس مختصر قیام میں اس نے انہیں کیا دیا ہے ـــــ وہ تو اپنے قلم کا نشہ پورا کرنے کے لئے یہاں آ گیا تھا۔ مگر اب سوچ رہا تھا۔ اسے ان کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ یہاں تہذیب کی روشنی اور آسائش کی مہک آنی چاہیئے۔

اتنی بے شمار چیزیں جیپ میں رکھنا مشکل ہو گیا۔ تو اُس نے ان میں سے کچھ چیزیں اللہ وسایا کو تحفتہً دے دیں ... علی نے ادھر ادھر دیکھا۔ سکھو کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ جانے صبح صبح کہاں چلی گئی تھی۔ ان کو نو بجے روانہ ہونا تھا سفر بہت لمبا تھا ـــــ اور دوپہر سے پہلے وہ صحرا سے نکل جاتے تو اچھا تھا۔

بہرحال وہ سب سے رخصت ہو کر جیپ میں آ بیٹھا۔ اور جیپ اسٹارٹ ہی۔

صحرا کے آخری کنارے پر جہاں شہر کا سنہری آسمان نظر آ رہا تھا۔ ایک اونچے ے پر وہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی اونٹنی ٹیلے کے نیچے کھڑی جگالی کر رہی تھی۔

دُور سے ہی اُس نے جیپ کو دیکھ کر ہاتھ ہلانا ... شروع کر دیا تھا۔ جیسے لنے کا اشارہ کر رہی ہو۔

علی کو پہچانتے ذرا بھی دیر نہ لگی۔ وہ سکھو تھی۔ اس نے ٹیلے سے کچھ آگے جا کر پ روک دی۔ وہ ہانپتی کانپتی بھاگی چلی آ رہی تھی۔

جلدی سے جیپ کے قریب آئی۔ اس وقت علی گاڑی چلا رہا تھا۔

اُس نے سر اندر کیا اور ایک گٹھری علی کی گود میں ڈال دی۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ تمہارا تحفہ ہے علی سائیں"

"ارے میں تو پہلے ہی تحفے جمع کر کر کے تھک گیا ہوں۔ یہاں کے لوگ ت اچھے ہیں"

"تم بھی تو بڑے اچھے ہو سائیں ـــــ"

"مگر میں نے تو کسی کو کچھ نہیں دیا ـــــ"

"تمہیں کیا معلوم تم ہمیں کیا کیا دے کر جا رہے ہو" اس نے اپنی گلوگیر آواز

میں کہا۔

علی نے صاف محسوس کیا۔ اُس کی آواز میں لرزش تھی۔ عنابی ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھوں میں نمی آکر ٹھہر گئی تھی۔

"سکھو میں تمہارے لئے شہر سے بہت سی سوغاتیں لاؤں گا۔"

"علی ساتیں ——"، سکھو نے بڑی ہمت کر کے کہا۔

"ایک بات کا خیال رکھنا، انتظار کی موت بڑی کربناک موت ہوتی ہے۔ انتظار پانی کا ہو یا پُنوں کا ——"

"ارے وہ تمہارا پنوں کہاں گیا ——"

تمہارے آنے کے بعد میں نے اس کی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ روٹھ کر چلا گیا اور اب میں پھر تنہا ہوں۔"

"اچھا سکھو خدا حافظ۔ دعا کرنا ہمارا سفر ٹھیک کٹ جائے۔"

"اللہ بیلی ——"، سکھو کا ایک کانپتا ہوا خوفزدہ آنسو رخسار پر ڈھلک آیا۔

علی نے جھٹکے کے ساتھ جیپ اسٹارٹ کر دی —— یوں گھبرا کر بھاگا۔ جیسے بدروحیں پیچھا کر رہی ہوں۔ مڑ کر نہیں دیکھا۔ مبادا ٹیلوں کے اس دیس میں وہ سیاہ پتھر بن جائے۔

جیپ اڑ رہی تھی اور صحرا کی پاگل ہوائیں . . . اس سے اُلجھ اُلجھ کر اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ ہوا میں ایک گونج تھی۔ ایک لمبی گونج جیسے گنبد سے نکلی ہو

اور گنبد میں واپس بُلا رہی ہو . . . یہ گونج شہری ہوا کی سسکاریوں سے کہیں مختلف تھی ——

علی کا دل بیٹھنے لگا۔

"یار ٹیپ لگاؤ ——"، اُس نے طفیل سے کہا۔ اور طفیل نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔

سکھو کی درد بھری آواز گونج اٹھی۔

دل تانگ تانگ اے۔ اللہ جوڑ سانگ اے
سجناں دا ملنا۔ مشکل مہانگ اے

(میرا دل منتظر ہے۔ پل پل، ہر گھڑی۔ خدایا کوئی ایسا سبب بنا دے۔ کہ میرا بچھڑا ہوا ساجن آکر مجھ سے مل جائے۔ میں جانتی ہوں۔ بچھڑے ہوئے محبوب کا ملنا بڑا کٹھن ہے)

علی یار۔ یہ تُو نے کیا کر دیا ہے . . . . علی اپنے آپ سے اُلجھنے لگا۔ کہیں تجھ سے کوئی ظلم تو نہیں ہو گیا۔ تو نے ایک معصوم لڑکی کو مغالطے میں رکھا۔ سب کچھ اسے صاف صاف بتا دیتا —— تو اُس کے دل سے کھیلتا رہا . . . . . تو جانتا تھا۔ تو سب جانتا تھا —— اس کا کفارہ کیسے ادا کرے گا ——

یہ کیا کر دیا تو نے علی —— یہ کیا کر دیا . . . . .

بہت دیر تک علی اپنے آپ کو کوستا رہا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے خود ہی اپنے دل کو تسلّی دے لی۔
بھُول جائے گی۔ تھوڑے دنوں میں ہی لال خاں اُسے بیاہنے آجائے گا۔
سب بھُول جائے گی۔ میلے کی ہرنی کی مانند ـــــ نئے ماحول سے مانوس ہو جائیگی
سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ایسے ہی فکر کر رہا ہوں۔۔۔۔
لیکن صحرا کی آخری حدوں پر موتیوں کی طرح چمکتی ہوئی ریت سکھو کی آواز کے
ساتھ ساتھ بین کر رہی تھی۔۔۔۔

تساں بادشاہ ہو۔ ساکو غریبی
تساں دل نہ دلنٹاں ساڈی بے نصیبی
دل تانگ تانگ اے۔ اللہ جوڑ سانگ اے
سجناں دا ملنٹا مشکل سہانگ اے

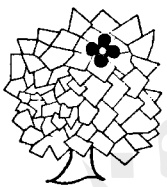

"او علی ـــــ کب آتے گی تمہاری منزل ہیں تو تھک گئی ہوں" کیتھی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"تھوڑی سی کافی پی لو۔ روکوں جیپ ـــــ" علی نے پیار سے کہا۔
"او نو ـــــ" وہ بیزاری سے بولی ـــــ "پچھلے چھ گھنٹوں سے تم مجھے کافی ہی پلاتے جا رہے ہو ـــــ"
"تو کیا پلاؤں میری جان ـــــ" علی نے انگریزی میں کہا۔ تاکہ ڈرائیور نہ سمجھ سکے۔
علی اور کیتھی اگلی سیٹوں پر تھے۔ اور ڈرائیور طفیل پیچھے سامان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ویسے وہ باہر کی طرف منہ کر کے مسلسل سگریٹ پیتا جا رہا تھا۔
"بس اب ہم پہنچنے والے ہیں" علی نے مستی میں ڈوب کر کہا۔ "دیکھنا تو

سہی ایسی خوبصورت جگہ ہے کہ تمہیں مزہ آجائے گا۔"

"ناک مزہ آجائے گا۔ . . . ہر طرف صحرا اور ریت نظر آرہی ہے۔ اس پر مجھے خوفناک قسم کے قصّے بھی سنا رہے ہو۔ مجھے تو یوں لگتا ہے ہم راستہ کھو چکے ہیں۔"

"تمہیں وہم ہو گیا ہے کیتھی ——— ویسے آج ہم صحیح وقت پر سفر کر رہے ہیں۔ اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں۔ ہم صبح چار بجے چلے تھے۔ بس ایک گھنٹے میں سکھو کے گھر پہنچ جائیں گے۔"

"یہ سکھو کون ہے ———؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا؟ اس کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ اور ٹیپ بھی سنوائی تھی۔"

"تم ایشیائی لوگ بڑے جذباتی ہوتے ہو۔ جھٹ تمہیں کسی سے عشق ہو جاتا ہے ———"

"او نو کیتھی پلیز ——— ذرا خیال کرو ———"

"ضرور تمہیں اس لڑکی سے عشق ہو گیا ہو گا۔" کیتھی نے ہنس کر کہا۔

"بھلا جو تمہارے جال میں پھنسا ہو۔ وہ زندگی بھر عشق کرنے کے قابل رہ جاتا ہے۔" علی نے ایک آنکھ بند کر کے کیتھی کی طرف دیکھا

کیتھی بڑے خوبصورت انداز میں ہنسنے لگی۔

"لڑکی واقعی خوب صورت تھی۔ اچھی تھی۔ مگر کاش میں تمہاری زلف کا اسیر

نہ ہو چکا ہوتا ——— ہائے پھر پھنس گیا تھا۔"

"تو پھر اب کیا لینے آتے ہو ———؟ وعدہ کیوں نبھا رہے ہو؟"

"تمہیں معلوم ہے یہ میری بہت بڑی جیت ہے۔ حکومت نے چولستان کے لئے بہت سی اسکیمیں منظور کر لی ہیں اور میں نے انہیں خوش خبری سنانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"اور وہ پیکٹ کہاں ہے؟"

"ممکن ہے سکھو کی شادی ہو چکی ہو۔ تو تم وہ کپڑوں کا پیکٹ اسے اپنی طرف سے تحفے میں دے دینا۔"

"اچھا ——— کئی بار تم یہ بات کہہ چکے ہو۔ میرا حافظہ کمزور تو نہیں ہے۔"

علی نے سگریٹ سلگا لیا۔ اور بولا

"کوئی اچھی سی کیسٹ لگاؤ کیتھی ———"

"کون سی لگاؤں ———؟"

"کوئی بھی لگا دو ———"

جیپ میں موسیقی گونجنے لگی۔

علی جب نیویارک سے جرنلزم کی ڈگری لینے گیا تھا۔ تو وہاں کے لوکل پرچوں میں پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔ تو وہیں پر اس کی ملاقات کیتھرین سے ہو گئی تھی ——— جو کسی دور دراز کے گاؤں سے شہر کی چکا چوند دیکھنے آ گئی تھی۔ وہ بھی

اخبار نویسی کو پسند کرتی تھی۔ گھوم پھر کر زندگی گزارنا چاہتی تھی۔

وہیں ایک شام اخبار کے دفتر میں اس کی ملاقات کیتھی سے ہوگئی
خوب صورت تھی۔ بے باک تھی۔ سمجھدار تھی۔ مگر ابھی تک اس میں سے کچے د
کی خوشبو آتی تھی۔ یہ بات علی کو بڑی انوکھی اور دلکش لگی ——— کیتھی کی زند
آنے والا پہلا لڑکا علی تھا ———

تب اس نے وطن چھوڑ دینے کا تہیہ کرلیا۔ مگر علی کی طرح کیتھی بھی گزا
کے لئے پارٹ ٹائم جاب کیا کرتی تھی۔ وہ بھی یونیورسٹی سے جرنلزم کی ڈگری
چاہتی تھی۔ دن کو پڑھتی۔ رات کو کام کرتی۔

علی کا تین سالہ کورس پورا ہوگیا تھا۔ اور کیتھی کے ابھی چھ ماہ باقی تھے،
لئے علی نے کیتھی کو منگنی کی انگوٹھی پہنادی۔ اور مستقبل کے سہانے وعدوں ا
دلکش خوابوں کے سہارے دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

اس عرصے میں دونوں کی خط وکتابت رہی۔ . . . . اور ہجر کی راتوں —
اور وصل کے دنوں کی داستان وہ ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ اسی آس پر کہا
آگے بڑھتی رہی۔

دو ماہ پہلے کیتھی اپنے وعدے کے مطابق یہاں آگئی تھی۔ علی کے والدا
نے اُسے قبول کرلیا تھا۔ وہ باقاعدہ مسلمان ہوگئی تھی۔ اس کا نیا نام کنیز فاطمہ رکھ
گیا تھا، لیکن اُسے علی ابھی تک کیتھی ہی کہتا تھا۔

کیتھی چاہتی تھی، ہنی مون کے لئے یورپ جایا جائے کیونکہ وہ کافی پیسہ جمع کرکے لائی تھی۔

مگر علی نے کہا وہ اپنا ہنی مون ایک انوکھی نرالی جگہ پر گذاریں گے ——— جہاں واقعی دُونی کی بو نہ ہوگی۔ وہ دونوں ہوں گے ——— پہاڑ سمت پھیلا ہوا سناٹا ہوگا۔ لمبی تنہائیاں ہوں گی۔

پھر دیکھیں گے کیا ہوگا ———؟

عام طور پر عاشق ومعشوق دنیا سے دور ایک جہان بنانے کا سوچتے ہیں اگر ایسا جہان مل جائے تو وہاں چل کر دیکھنا چاہیئے۔

اس کی ایسی نشہ آور باتیں سن کر کیتھی کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ ایشیائی لوگ جذباتی ہوتے ہیں۔ محبت بھی ٹوٹ کر کرتے ہیں۔ اور ان کی محبت میں ملاوٹ بھی نہیں ہوتی ——— اُسے علی کا یہ گرم انداز اور جوشیلا پن بہت اچھا لگتا تھا۔

وہ بھی دو دلوں کا بسایا ہوا ایک نیا جہاں دیکھنے یہاں تک چلی آئی تھی اور اب اس طویل سفر سے تھک گئی تھی۔ گورے رخساروں پر دو سرخ دھبے پڑ گئے تھے۔ منی سی نازک ناک لال ہوتی جاتی تھی۔ ستارہ سی چمکدار آنکھوں میں تھکاوٹ بیٹھ گئی تھی۔

لیکن علی اسے برابر تسلیاں دیتا آرہا تھا . . . . اور اسے بتا رہا تھا کہ ان کے "گوپے"، حجلۂ عروسی کے لئے بہترین بدل ہیں۔ اور یہ کہ ہم اپنا گوپا خود بنائیں گے ——— اور یوں رہیں گے اور یوں کریں گے ———

کیتھی برابر جمائیاں لے رہی تھی۔

جب دور . . . . کچھ لوگوں کا غبار سا نظر آیا۔ ذرا اور قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہاں ایک جمگھٹا تھا۔ غالباً مرد و زن سب جمع تھے۔ شاید کوئی شادی یا تہوار ہو گا۔

علی نے کیتھی کو یہی بتایا۔ کیونکہ دور سے کچھ بھی پتہ نہ لگ رہا تھا۔

جب وہ کچھ اور قریب ہوئے تو علی نے دیکھا۔ اوپر درخت پر ایک کپڑا لٹک رہا تھا۔

"اوہ ——" علی بولا "میرا خیال ہے کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔"

"حادثہ —— کیسا حادثہ ——" کیتھی بولی

"وہی میں نے تمہیں بتایا تھا نا ؟ کہ صحرا میں جب کوئی پیاس سے مرنے لگتا ہے تو وہ . . . . ."

"اچھا اچھا ——" کیتھی بولی۔ جلدی سے ان کے قریب چلو —— ہمارے پاس بہت پانی ہے اور کافی بھی ہے۔ شاید ہم ان کی مدد کر سکیں۔"

علی نے ذرا فاصلے پر جیپ روک لی۔ اور بولا

"تم ابھی بیٹھو میں دیکھ آتا ہوں۔"

"یہ پانی تو لیتے جاؤ ——" کیتھی نے فلاسک آگے کی۔

علی نے فلاسک پکڑ لی۔ اور اس ہجوم کی طرف بڑھا۔

ب پلٹ کر علی کو دیکھنے لگے۔

لی نے ان کے لب و لہجے میں انہیں سلام کیا۔ اور بولا۔ "دوستو کیا ہوا ہے۔"

لی نے جواب نہیں دیا۔ بس ٹک ٹک اسے دیکھتے رہے

ب علی ایک ایک شکل دیکھنے لگا۔

ایک چہرہ —— دوسرا چہرہ —— ایک آدمی۔ دوسرا آدمی ——

کے چہرے ایک جیسے تھے۔

سب کے چہرے زرد تھے۔

سب گونگے بن چکے تھے۔

سب کی آنکھیں رو رہی تھیں۔

اچانک علی کی نگاہ۔ اللہ وسایا پر ٹک گئی۔

"اللہ وسایا بھائی اللہ وسایا ——" وہ دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ "بتاؤ

یا ہوا ہے بھائی۔ مجھے بتاؤ ——"

اس نے نظریں جھکا لیں۔

"کیا مجھے پہچانتے ہو ——" علی نے کہا۔

اللہ وسایا نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسی وقت اسے ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ جو سب مردوں سے پرے لڑی تھی۔ علی نے دیکھا وہ زینو تھی۔

"زینو بہن کیا ہوا ہے؟"

وہ اس کے قریب چلا گیا۔

"علی سائیں ـــــ علی سائیں ـــــ" وہ چیخیں مار مار کر رونے

"وہ ہم سے روٹھ گئی ہے ـــــ"

"کون ـــــ؟"

"سکھو ـــــ ؟؟ ـــــ"

سکھو ـــــ سکھو ـــــ سکھو ـــــ"

علی کا دل دھک دھک کرنے لگا ـــــ

"کیسے ـــــ کب ـــــ کیوں ـــــ؟"

"پیاس سے تڑپ تڑپ کر ـــــ"

"پیاس سے ـــــ مگر وہ تو صحرا کے سب راستے جانتی تھی۔"

"کل رات وہ اپنی ایک سہیلی کو ملنے ساتھ کے گاؤں گئی تھی۔ صبح تک نہیں لوٹی تو سب کو فکر ہوئی ـــــ سہیلی کے گھر سے پتہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ وہاں گئی ہی نہیں تھی ـــــ پھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہماری نظر درخت پر ٹنگے ہوئے اس دوپٹے پر گئی۔ اس کی نشاندہی پر یہاں پہنچے، مگر سکھو جا چکی تھی۔"

"سکھو چلی گئی ـــــ" زینو چیخنے لگی۔

علی نے سب کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور جنگل کی طرف منہ کر لیا۔

ی وقت زینو بغل سے نکل آئی۔ اور بولی۔

علی سائیں۔ اگلے ہفتے سکھو کی شادی ہونے والی تھی۔ تاریخ طے ہو گئی

گر وہ روز تمہاری راہ دیکھتی تھی۔ روز خواب دیکھتی تھی ـــــ روز پاگلوں

باتیں کرتی تھی ـــــ

علی سائیں، سکھو کو صرف انتظار کی پیاس تھی۔

علی سائیں سکھو مٹی سونگھ کر راستوں کی پہچان کر لیتی تھی۔ علی سائیں سکھو

وم تھا کہ چشمے اور ٹوبے کہاں کہاں ہیں ـــــ

علی سائیں۔ میری سکھو۔۔۔۔

علی سائیں۔ میری سکھو ـــــ"

علی نے مڑ کر دیکھا۔ ریت کے اوپر ایک لاش پڑی تھی۔ جس پر انہوں نے

چنری ڈال دی تھی ـــــ

درخت پہ ایک کالی چنری جس پر سرخ شیشے لگے تھے، لہرا رہی تھی۔ جیسے

دبلا رہی ہو۔

اشارے کر رہی ہو۔

علی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ شوخ اور چنچل ناریوں بے سُدھ پڑی تھی۔ اسے

گمان ہوتا۔ ابھی دوپٹہ ہلے گا۔ وہ اُٹھ بیٹھے گی ـــــ سب کو دیکھ کر قہقہہ

ئے گی اور کہے گی۔

کوڑ کوڑ ——— (جھوٹ جھوٹ)

میں نے تو سب ناٹک جھوٹ موٹ کھیلا تھا۔

علی کا بے اختیار دِل چاہا کہ وہ سرخ کپڑا ہٹا دے۔ مگر اچانک اسے کے الفاظ یاد آ گئے۔

"علی سائیں، انتظار کی موت بڑی کربناک ہوتی ہے۔ خواہ وہ پانی کا ہو یا پُنوں کا ———"

اس کا دِل چاہا ———

وہ سکھو کے قدموں پہ اپنا سر رکھ دے۔

اور کہے ———

او البیلے دیس کی عظیم نار!

تیرے آگے مَیں ہار گیا ———

تو "صادق دوست" تھی اے صحرائی دوشیزہ۔

میں تیرے جذبوں کا اہل نہیں تھا۔

مجھے معاف کر دے ——— مجھے معاف کر دے ——— میں اس اتنے بڑے کو اٹھا کر زندہ نہ رہ سکوں گا ———

اس نے جلدی سے پانی کی بھری ہوئی فلاسک زمین پر رکھ دی ——— اور جیپ کی طرف دوڑ گیا۔

عجلت سے اندر بیٹھ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

کیتھی استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

مگر اُس نے ٹیپ بھی لگا رکھی تھی۔

سکھو کی پُرسوز آواز۔۔۔۔ اس کے اِرد گرد طواف کر رہی تھی۔

رُٹھے یار ڈاڈھے اوکھے منیدن

منتاں کریدن، زاراں کریدن

خواجے خضر دے ڈیوے بلیدن

ہتھ بدھ کھڑیدن۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

رُٹھے یار ڈاڈھے اوکھے منیدن

ناولٹ

دِل اور رُوح

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

محفل اپنے شباب پر تھی۔ تقریباً شہر کے تمام معززین آ چکے تھے۔ صنعت کار، اعلیٰ سرکاری ملازمین۔ جج صاحبان۔ کاروباری لوگ۔ مشہور و معروف شاعر و ادیب، مصور و موسیقار۔

ٹی وی فنکار، ریڈیو فنکار ـــــ کون تھا جو اس محفل میں نہیں تھا ـــ جس طرح مختلف قسم کے پھولوں کا ایک دیدہ زیب گلدستہ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح آج کی محفل سجی ہوئی تھی۔

ہر فکر و خیال کے لوگ الگ الگ ٹولیاں بنا کر اپنے اپنے دائرے میں کھڑے ہوتے تھے ـــــ باتوں کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ـــ قہقہوں کی رم جھم پھوار تھی ـــ اور لطیفوں اور چٹکلوں کی دھنک رنگ پتیاں اِدھر اُدھر بکھر رہی تھیں۔

دُور پرے ہلکی ہلکی موسیقی رات کا جادو جگا رہی تھی اور بیرے ٹرے اٹھائے

سُوپ اور جُوس سرد کر رہے تھے۔

جتنے مرد تھے تقریباً اتنی ہی خواتین بھی تھیں۔

بھلا اس کرۂ ارض پر کوئی محفل بغیر خواتین کے بھلی لگ سکتی ہے ـــــ؟ نہیں تو ـــــ؟

تبھی تو آدم کی پسلی شق ہو گئی تھی۔

اور اُس نے عورت کی صورت میں ایک ناتمام آرزو کو جنم دیا تھا۔

تمام خواتین حسب معمول قیمتی ملبوسات، اور خیرہ چشم زیورات میں لدی پھندی تھیں۔ ہیرے کی انگوٹھیاں اور کندن کے آویزے چہروں سے زیادہ چمک رہے تھے

یوں لگتا تھا یہاں جدید ترین فیشن کا کوئی میلہ سا لگا ہے ـــــ عورتیں گفتگو میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اور کمرے کی روشنی کو سگریٹ و پائپ کا دھواں ملگجا بنا رہا تھا۔ بالکل اُس منظر تھا، جیسے کسی کا سیٹم پکچر کا سیٹ لگا ہو۔

جب ایک دم موتیا کو اختلاج سا ہونے لگا۔

یونہی رنگ بھری اُمنگ بھری محفلوں میں بیٹھے بیٹھے موتیا بیگم چونک جایا کرتی تھی۔ گھبرا جاتی ـــــ بے اختیار اس کا دل چاہتا کہ ہر فریب کا پردہ چاک کر دے۔

خوبصورت اسمارٹ خواتین نے اُسے گھیر رکھا تھا اور انتہائی لایعنی سوالات

رہی تھیں۔ بغیر وجہ کے اس کی اِک اِک شے کی تعریف کر رہی تھیں۔

موتیا نے اس وقت مونگیا رنگ کی فرنچ شیفون کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جس پر دھانی رنگ کے ستاروں کا کام چمک رہا تھا۔ اسی مناسبت سے کانوں میں سچے موتیوں کے بُندے تھے اور ہاتھ میں ڈائمنڈ کی ایک انگوٹھی ـــــ دوسری کلائی پر ڈائمنڈ کی ڈریس واچ بندھی تھی۔ اور بس۔

ایسا نہیں کہ موتیا کے پاس ملبوسات و زیورات کے انبار نہیں تھے ـــــ مگر وہ ہمیشہ تیار ہوتے وقت سادگی کو ملحوظ رکھتی تھی۔

اس کی ناک میں ہیرے کی ایک کیل تھی۔ کبھی کبھی جب روشنیاں اس کیل پر منعکس ہوتیں تو ننھی ننھی رنگ برنگی شعاعیں پھڑک کر اِدھر اُدھر ہو جاتیں۔ ان شعاعوں میں عورت کا دل اٹک اٹک جاتا۔

موتیا بڑے سبھاؤ سے ـــــ ٹھہر ٹھہر کر ہر عورت کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی اور ہر مہمان سے اس کا حال چال پوچھ رہی تھی۔

اس بڑی ضیافت کی وہ آج میزبان تھی۔

اور اس "بڑے آدمی" کی بیوی تھی۔ جس کے ساتھ ذرا سا تعلق رکھنا۔ آج شہر کا ہر فرد فخر جانتا تھا۔

عورتیں تو تعلقات ملانے میں اتنی فیاض ہوتی ہیں کہ موتیا کے منہ پر ہی اُس کی تعریف کرتے نہ تھکتی تھیں۔

"ہائے اللہ — آپ کے یہ ڈائمنڈ کتنے خوبصورت ہیں۔ کہاں سے لئے؟"

"ظاہر ہے اُن کے شوہر لاتے ہوں گے۔" دوسری نے کہا۔

"وہ تو ان کے لئے ساری دُنیا کے نوادرات لاتے ہوں گے بھئی" تیسری نے رشک میں ڈوب کر کہا۔

موتیا صرف مسکرادی۔

جانے اُسے یہ سوال اتنا غیر اہم کیوں لگا — ؟

پھر ایک خاتون بولی "آپ کبھی ایبروڈ گئی ہیں — ؟"

"نہیں" موتیا نے صرف نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں — ؟"

"ہائے اللہ کیوں — ؟"

سب عورتیں اس کے پیچھے یوں پڑ گئیں۔ جیسے اس نے انجانے میں کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔

"مجھے شوق نہیں ہے" موتیا نے آہستہ سے یوں کہا۔ جیسے موتیا کا پھول زمین پر گرا دیا ہو۔

"اوہ — " سب عورتوں کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔

"کیوں شوق نہیں ہے آپ کو دنیا دیکھنے کا — ؟"

"دنیا میں دیکھنے کو کیا ہے — ؟" موتیا نے یوں اجنبی اجنبی آنکھوں

اٹھا کر سوال کیا۔ جیسے اس کی آنکھوں میں گوتم بُدھ اُتر آیا ہو۔

ساری عورتوں کو اس وقت وہ انتہائی بے وقوف اور احمق قسم کی چیز دکھائی دی جس کا شوہر اتنا امیر تھا — سال میں چار مرتبہ باہر جاتا تھا۔ اس کے لئے دنیا کا چکر لگا کے آنا بازیچۂ اطفال ہی تو تھا۔

اس کی بیوی کہہ رہی تھی۔ دُنیا میں دیکھنے کو کیا ہے؟

ساری عورتیں اس کے ساتھ اُلجھ پڑنا چاہتی تھیں۔ وہ عورتیں جنہوں نے امریکہ، پیرس، لندن، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کے خواب دیکھ رکھے تھے — وہ جنہوں نے بیرونی اشیاء دیکھ اور سُن رکھی تھیں — اور جن کو ہوس تھی طلب تھی — اور وہ جو کبھی کبھار ہفتے عشرے کو ہو آتی تھیں اور کھانا پینا، ہنسنا گھومنا۔ خرید و فروخت کرنا جن کا مسلک تھا۔

وہ جو کسی بھی قیمت پر دنیا کا چکر لگانا چاہتی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں موتیا کی ہنسی اُڑا رہی تھیں، اسے پاگل قرار دے رہی تھیں۔

ویسے اس کے مرتبے کا تقاضا یہ تھا کہ منہ پر کچھ نہ کہیں — منافقت ہی کرتی رہیں۔

تب ایک بولی۔ "ان کو ملک سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے — ؟ ذرا ان کا گھر تو دیکھو — دُنیا کی کونسی آسائش اس گھر میں نہیں — یہ گھر نہیں جنت ہے — "

مونیا ذرا سا مسکرائی اور بولی "ایسی بات نہیں ہے ـــــ اللہ کی بنائی ہوئی دنیا بہت خوبصورت ہے۔ اسے دیکھنا چاہیے۔ مگر مجھے ـــــ شاید مجھے دنیا میں کچھ نظر نہیں آتا ـــــ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، انسان کے اپنے اندر بھی ایک دنیا ہے ـــــ اندر بھی ایک جہان ہے ـــــ جو اس جہان وہم و گمان سے کہیں حسین ہے ـــــ؟ جب آدمی اپنے من کی دنیا کا سراغ لگا لیتا ہے ـــــ تو مادّی دُنیا کی کوئی حیثیت نہیں رہتی اس کی نظر میں ـــــ"

کسی عورت کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ـــــ انہوں نے مونیا کو یوں دیکھا جیسے وہ آسیب زدہ ہو ـــــ پھر دل ہی دل میں اس کی مردہ دلی پر تاسف بھی کیا مگر اس کے منہ پر بولیں "ہائے اللہ کتنے شاندار خیالات ہیں آپ کے ـــــ؟"

"اللہ بتائیں تو سہی یہ فلسفہ آپ نے کہاں سے سیکھا؟"

"کہاں سے سیکھا ـــــ؟" مونیا اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھنے لگی۔

کتنی مختصر اور کتنی صاف تھیں اس کے ہاتھ کی لکیریں۔ نہ گولائیاں نہ دائرے ـــــ نہ کراس نہ کٹاؤ... نہ جزیرے۔

بس دل اور دماغ اور ایک لمبی سی زندگی کی لائن۔

تب وہ سوچنے لگی

مصیبت ہے یہ لمبی زندگانی

بزرگوں کی دعاؤں نے مار ڈالا

مونیا کو اپنے ہاتھ کی لکیروں میں گم دیکھ کر خواتین نے موضوعِ سخن بدل ڈالا۔ ادھر ادھر اُدھر ـــــ ایک دوسرے کا مزاج درست کرنے لگیں۔

لیکن کچھ خواتین ایسی ضرور تھیں۔ جو دل ہی دل میں مونیا کو جاہل سمجھ رہی تھیں ناشکری بھی ـــــ!

سوچ رہی تھیں۔ اللہ بھی کتنا بے نیاز ہے ـــــ کیسے کیسے مادھوؤں کو دھن کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔

جب سب لوگوں نے کھانا کھا لیا۔ تو پھر ٹولیوں میں بٹ کر قہقہے اور گنگناہٹیں تقسیم کرنے لگے ـــــ اب کے ٹولیوں میں عورتیں اور مرد مل جل کر کھڑے ہوئے تھے ـــــ ایسے میں مونیا کو اختلاج ہونے لگتا تھا۔

اس نے سوچا اب یہ مصنوعی چہرے جانا شروع ہوں گے۔ وہی بندھے ٹکے فقرے۔

"کھانا بہت اچھا تھا ـــــ"

"گھر بڑا شاندار ہے ـــــ"

"آپ بڑی خوبصورت ہیں ـــــ"

"شکریہ ـــــ"

"تھینک یو ـــــ"

وہی لگی لپٹی ـــــ

وہی انداز ——

پھر اسی پل صراط سے گزرنا پڑے گا۔

مونیا چپکے سے محفل میں سے کھسک آئی اور راہداری پار کر کے اپنی اسٹڈی میں چلی گئی۔

کیونکہ وہ میزبان تھی —— اس لئے کئی بار محفل سے نکل آیا کرتی تھی۔ بندوبست جانچنے کے لئے نوکروں کو نئی ہدایات دینے کے لئے —— اس کی عدم موجودگی کو کوئی محسوس نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب کے جو وہ محفل سے نکل آئی تو واپس جانے کے لئے نہیں۔

وہ ذہنی طور پر شل ہو گئی تھی اور دوبارہ اس مرحلے سے نہیں گزرنا چاہتی تھی۔

آج کی ضیافت کوئی کاروباری ضیافت نہ تھی۔ بلکہ نئے سال کی آمد کی خوشی میں اس بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

جب آدمی بہت بڑا ہو جائے تو اُسے کسی حیلے بہانے سے ضیافتیں کرنی پڑتی ہیں۔

لوگوں میں اپنی بڑائی کے تصوّر کو قائم رکھنے کے لئے۔

لوگوں سے رابطہ رکھنے کے لئے

اور اپنی دھاک بٹھانے کے لئے

یہ ایک کاروباری آدمی کی مجبوری ہی ہوتی ہے —— کہ اس کا نام کسی حیلے وسیلے سے لوگوں کے لبوں پر رہے۔

مونیا اوپر اپنی لائبریری میں آ گئی۔

یہ اُس کی دنیا تھی —— کتابوں کی دنیا!

اس نے اپنا مٹک کا سیاہ سٹول اتار کر کرسی کے بازو پر ڈال دیا اور اپنی مطالعے کی کرسی پر بیٹھ گئی —— کرسی دھیرے دھیرے جھولنے لگی۔

جیسے کہہ رہی ہو ——

"آجاری نندیا تو آ کیوں نہ جا"

اس کرسی پر بیٹھ کر مونیا کو کیسا سکون ملتا تھا؟

جیسے یہ کرسی گیان دھیان کی کرسی ہو۔

اسی کرسی نے ہزار بار اُسے جذبات کے بپھرتے شعلوں کی آنچ سے بچایا تھا۔

کوئی کسی طور پر پناہ لیتا ہے —— کسی کو جنگلوں میں رب مل جاتا ہے

کوئی تخت چھوڑ کے مشکیزہ ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے ——

سارے کھوجی ہیں ——

اس کو بھی ایک کرسی مل گئی تو جیسے تن من شانت ہو گئے۔

آنکھیں بند کئے —— وہ کتنی دیر تک جذب و کیف کے عالم میں اس کرسی پر پڑی رہی —— کرسی دھیرے دھیرے ہلتی رہی —— جیسے مدھم سانسوں کے نیچے سُر خ دل ہولے ہولے بجا کرتا ہے ——

اسی عالم میں پڑے رہنا اس کا مشغلہ تھا —— اور اسی عالم میں اس پر

سے کئی عالم گزر جاتے تھے ——

بیٹھی رہی اور —— نیچے جو شور و غوغا ہو رہا تھا۔ اس کو سنتی رہی — غالباً لوگ جا رہے تھے۔ اس لئے خدا حافظ کے ساتھ ساتھ شکریے کے پھول بھی ہا رہے تھے۔ جانے والوں کا یہی دستور ہے۔

جھک جھک کر ہاتھ ملاتے ہیں اور ہنس ہنس کر اپنی رفاقت کا یقین دلاتے ہیں —— اس کا شوہر باقاعدہ ہر ایک کا شکریہ وصول کر رہا تھا۔

اس رسم کو بھی ضیافت کی طرح باقاعدگی سے نباہنا پڑتا ہے —— لیکن وہ اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھی رہی۔ اُسے معلوم تھا اس کا شوہر اس کی اس کج ادائی کا بُرا نہیں مانے گا۔

بُرا نہ ماننے کی رسم کا بیج تو اس گھر میں موتیا نے بویا تھا۔

اس کی میز پر ابھی تک تصوّف کی ایک کتاب کھلی پڑی تھی —— الفاظ اسے لُوٹ چکے تھے —— اور اسرار میں لپٹے معانی اس کا پیراہن دل بدل چکے تھ

"میں کہاں ہوں ——؟" اس نے اپنے آپ کو صدائیں دیں —— پکارا ——

تو چلبلی، مہکتی —— مسکراتی . . . . کلی کلی "موتیا گلزار" باہر نکل آئی اور اس کے سامنے میز پر بیٹھ گئی اور بولی۔

"میں گلزار صاحب کی نٹ کھٹ اور ضدّی بیٹی تھی۔ گلزار صاحب کو بہت

ق تھا۔ ان کی بیٹی پیدا ہو تو وہ اس کا نام موتیا رکھ دیں۔ شاید گلزار صاحب وتیا کے پھولوں کی خوشبو بہت پسند تھی . . . . . سو اللہ نے ان کو ایک بیٹی ے دی۔ جو گھر میں موتیا کے پودے کی طرح بڑھتی، مہکتی اور کھلتی رہی اور ار اگھر اس کی خوشبو سے گلزار بنا رہا ——

مگر اچانک موتیا کے گلزار کو نظر لگ گئی اور موتیا کی امّی —— موتیا کے لئے دی اور بہن بھائی لانے کی جستجو میں بہت دور چلی گئیں۔

تب پاپا کو موتیا پر ٹوٹ ٹوٹ کر پیار آیا۔ کلیجے سے لگائے رکھا —— اور وں کو اپنے بستر پر سُلایا . . .

میں وہی موتیا ہوں۔ پاپا نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں ان کے پیار میں ڈوب رساری دنیا کو بھول گئی۔

باپ کا پیار بھی عجیب شے ہوتا ہے

میرا یونیورسٹی کا فائنل ہو رہا تھا۔ پرچہ ہونے میں بیس منٹ رہ گئے تھے۔ میں کیمپس سے قریب ہی رہا کرتی تھی اس لئے پندرہ منٹ پہلے گھر سے نکلا کرتی تھی۔

میں جونہی اپنی لمبی سی موٹر میں گھر سے باہر نکلی، اپنے نوٹس کی کاپی کھول لی تاکہ چیدہ چیدہ موضوع دیکھتی جاؤں۔ نوٹس پر سے نگاہ ہٹا کے میں نے ذرا آگے دیکھا تو ایک لڑکا سڑک پر ہانپتا کانپتا دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اور دوسرے ہاتھ میں پین اور پنسلیں تھیں۔

اس کی چال اور تردّد سے مجھے اندازہ ہُوا کہ غالباً وہ بھی کمرۂ امتحان کی جانب جا رہا ہے ورنہ یوں یونیورسٹی کی طرف رُخ کر کے دوڑ نہ رہا ہوتا۔

میری موٹر زن سے اس کے قریب سے گذر گئی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پرچہ شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ تھے۔ مَیں موٹر میں تھی۔ یقیناً بروقت پہنچ جاتی۔ مگر اُس کو چل کے آنے میں پندرہ منٹ لگتے تھے۔ میں نے فوراً فیصلہ کیا اور ڈرائیور سے کہا "گاڑی ریورس کرو۔"

ڈرائیور نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں" میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا "وہ لڑکا جو دوڑا آ رہا ہے، اُس کو گاڑی میں بٹھا لو۔"

ڈرائیور نے ایسا ہی کیا۔

جب ہماری گاڑی ریورس گیئر میں چلتی ہوئی اس کے آگے اچانک رُک گئی تو وہ ششدر ہو کر ہمیں تکنے لگا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی، یقیناً وہ کسی مذاق کے موڈ میں نہیں تھا۔

مَیں نے جلدی سے شیشہ نیچے کیا اور منہ باہر نکال کر کہا۔

"میں بھی ایگزامینیشن ہال میں جا رہی ہوں۔ پرچہ شروع ہونے میں بالکل تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ اگر آپ امتحان دے رہے ہیں تو پلیز گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ ورنہ تکرار میں مجھے بھی دیر ہو جائے گی۔"

اس کی آنکھوں میں غصّے اور تحقیر کی ایک ہلکی سی لکیر روشن ہوئی۔ وہ ان سے کچھ کہنے کے قابل نہیں تھا، کیونکہ اس کا تنفس بہت تیز تھا۔ اس جلدی میں اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور پھر سر یوں ڈالا جیسے ہار مان لی ہو جلدی سے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ اس نے دروازہ شائستگی سے بند کیا جیسے موٹر میں بیٹھنے کا عادی ہو۔

میرا خیال تھا اب وہ مختصراً اپنے پیدل چلنے کی روداد بیان کریگا ——

تاخیر ہو جانے کی وجہ بتائے گا اور پھر جُھک جُھک کے شکریے ادا کریگا۔

اس نے ایسا نہیں کیا۔

اپنی بے ترتیب سانس درست ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور جیب سے سائیکلوسٹائل پرچے نکالے اور جلدی جلدی ورق گردانی کرنے لگا۔

میں دوبارہ اپنے نوٹس پر جھک گئی۔

امتحان کے آخری لمحوں میں گو پڑھا ہُوا سمجھ میں بالکل نہیں آتا مگر ہر طالب علم جیسے اپنے آپ کو یقین دہانی کرانے کے لئے —— یونہی کتابوں پہ جھک جاتا ہے .....

تھوڑی ہی دیر میں راستہ ختم ہو گیا۔ جب ڈرائیور نے ہمیں ہال کے باہر اتارا تو کمرۂ امتحان میں جانے کی گھنٹی بج چکی تھی۔ ہال کے باہر لڑکوں اور لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ سبھی کتابیں بھینچ کر یوں اندر کو لپک رہے تھے جیسے جزا و سزا کا حساب ہونے والا ہو۔

جونہی ہماری موٹر کھڑی ہوئی، وہاں موجود ہر شخص نے ہمیں بڑے غور سے دیکھا۔ ایک تو موٹر والی لڑکی کا موٹر سے اُترنا ہی بڑی بات ہے۔ اس پہ ایک لڑکا بھی ہمراہ لانا —— مجھ پر بھی کڑی امتحان کو دیکھ کر بوکھلاہٹ طاری ہوگئی۔ میں بھی جلدی سے نکل کر ہجوم میں گم ہوگئی۔

پرچہ ہاتھ میں لے کر جب میں حل کرنے کے لئے جھکی تو ہال کی طلسمی خاموشی میں مجھے ایک دم اس لڑکے کا خیال آگیا۔ پتہ نہیں وہ موٹر سے نکل کر کہاں چلا گیا تھا——؟

اس کا سینٹر مہی ہال تھا یا کوئی اور جگہ —— بہرحال بدتمیز اور گنوار تھا —— شکریہ تک ادا نہ کیا —— دفع کرو —— میں اس کا خیال جھٹک کر پیپر پر جھک گئی۔

ویسے میرے لاشعور میں کہیں تھا، جب میں پیپر دے کر باہر نکلوں گی تو وہ پھول لئے کھڑا ہوگا۔ آگے بڑھ کر میرا شکریہ ادا کرے گا اور فخر سے لوگوں کو بتائے گا کہ آج اس لڑکی نے مجھے لفٹ دی تھی۔

پیپر دینے کے بعد جب میں موٹر کی طرف جا رہی تھی تو سڑک پہ دُور دُور تک اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

'چھوٹے گھر کا ہوگا'، میں نے دل میں گالی دی۔

تہذیب و تمدن سے آشنا نہیں ہوگا۔

کسی نے MANNERS نہ سکھائے ہوں گے۔

جس دن میں آخری پیپر دے کر باہر نکل رہی تھی تو اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی موٹر کو

کرنے لگی —— غالباً ابھی میری موٹر نہیں آئی تھی۔ شاید میں وقت سے پہلے باہر آئی تھی —— یا ڈرائیور کو کچھ ہوگیا تھا۔

میں لڑکوں کے ایک ہجوم کے قریب سے گزری تو دیکھا دوسری طرف وہ بھی دو لڑکوں کے ساتھ کھڑا تھا ——

وہی نیلی پتلون اور سفید دھاری دار قمیص —— جو اُس نے پہلے روز پہن رکھی تھی۔ میں نے بہت اچھی طرح پہچان لیا مگر اُس کے قریب سے یوں گزر گئی۔ جیسے اسے پہچانا ہو۔

تو اس کا ایک ساتھی مجھے دیکھ کر جھٹ بولا "یار تو اس دن اس لڑکی کے ساتھ تھا نا ——؟"

پتہ نہیں اس نے کیا جواب دیا۔ میں نے سُنا نہیں۔

پھر وہی لڑکا بولا "کم بخت جا کر اس کا شکریہ تو ادا کر ——"

"بعض اوقات شکریہ ادا کرنے کا مطلب لڑکیاں غلط لیتی ہیں۔ وہ مجھے عام سی لڑکی لگی —— ٹھیک ہے اس نے میرے ساتھ مہربانی کی —— اگر وہ مجھے لفٹ نہ دیتی شاید میں وقت پر نہ پہنچ پاتا۔ مجھے اس کی یہ مہربانی کسی نیکی کی طرح یاد رکھنی چاہیئے۔ لڑائی گھٹیا پن کر کے اسے بدصورت نہیں بنا لینا چاہیئے۔"

میں جب گھر واپس جا رہی تھی۔ تو اس کے فلسفے پر غور کر رہی تھی۔

عجیب سا لڑکا تھا ——

عام لڑکے ایسی باتیں نہیں کرتے ـــــ
لڑکیوں سے باتیں کرنے کے بہانے ڈھونڈھتے ہیں۔

میرا امتحان ختم ہوگیا ـــــ یونیورسٹی کے چکر بھی بند ہوگئے اور میں انگریزی کے دل پڑھ پڑھ کر اور اُردو کے گانے سُن سُن کر تھک گئی تھی ـــــ وقت گزرنے کا م نہیں لیتا تھا۔ مجھے تو ہمیشہ تیز تر اور ہنگاموں سے بھرپور زندگی پسند آتی تھی۔

"لپٹنا جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا"

اس لئے پاپا کی کار لے کر آوارگی کرنے کی مہم شروع کر دی ـــــ کبھی ایک سہیلی کے گھر ـــــ کبھی دوسری کے گھر ـــــ

کبھی ایک سینما ہال میں دھما چوکڑی مچاتے۔ کبھی دوسرے میں۔

پاپا میرے سب سے اچھے دوست تھے۔ ممی کے انتقال کے بعد انہوں نے پُورا پُورا حقِ دوستی ادا کیا تھا۔ جب باپ کی شفقت دوستی میں بدل جاتی ہے تو لڑکی میں بلا کی خود اعتمادی آجاتی ہے ـــــ پاپا نے مجھے ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی۔ اس لئے

میں آزادی کا غلط استعمال نہیں کرتی تھی ـــــ دراصل اعتماد اتنا بڑا ہتھیار ہے جس سے والدین اپنی منہ زور اولاد کو بھی اپنا مطیع بنا سکتے ہیں۔

میں سڑکوں پر دندناتی پھرتی تھی۔ مگر میں نے کبھی کوئی اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں کی تھی۔

ایک دن میں نہر کے کنارے کنارے موٹر لئے جا رہی تھی کہ میں نے دیکھا وہی لڑکا سڑک کراس کر رہا تھا ـــــ وہی نیلی پتلون اور سفید دھاری دار قمیص ـــ جانے اسے دیکھ کر شرارت کرنے کو جی چاہا یا کچھ کے لگانے کو ـــــ

میں نے اس کے آگے جا کر موٹر روک دی۔

پتہ نہیں کیوں بعض حرکتوں پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا ـــــ بے اختیاری طور پر سرزد ہو جاتی ہیں۔

میں نے دروازہ کھولا تاکہ باہر نکل آؤں۔ مگر اُس نے مجھے باہر نکلنے نہیں دیا۔ دروازہ پکڑ کے راہ میں حائل ہو گیا اور اپنی کرخت آواز اور کھردرے لہجے میں بولا۔

"میں ایک غریب آدمی کا بیٹا ہوں اور آپ نہیں جانتیں۔ غریب آدمیوں کے بیٹے بڑے AMBITIOUS ہوتے ہیں۔ اُن کے ذہن و دل میں اپنے کیریئر کی آگ جل رہی ہوتی ہے۔ وہ اس دنیا کو کچھ کر کے دکھانا چاہتے ہیں ـــــ کچھ بن کے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جن سڑکوں پر وہ جوتے چٹخاتے پھرتے ہیں۔ انہی سڑکوں کو اپنی موٹروں سے روند کر اپنا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اور آپ جانتی ہیں۔ جب کوئی

یرزادی سڑک پر رُک کر اپنی کار کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ تو کیا ہوتا ہے ـــــ"

میں اب تک حیران بیٹھی اس کے منہ کو تک رہی تھی۔

طنزیہ بولا۔

"اس کے پرکاٹ دینا چاہتی ہے ـــــ تاکہ پرواز نہ کر سکے۔ آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی ـــــ جوانی منہ زور ہوتی ہے اور حسن ایک ظالم حقیقت ہے۔ آپ جوان بھی ہیں۔ حسین بھی ہیں۔ ماشاء اللہ امیر بھی ہیں۔ مشقِ ستم کے لئے کوئی لھاتا پیتا امیرزادہ ڈھونڈ لیجئے نا ـــــ! مجھے اپنے عشق کی آگ سے کیوں ہلاک رنا چاہتی ہیں ـــــ! میں تو بہت بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔ میرے باپ نے رزقِ حلال سے میری تربیت کی ہے اور میری ماں ... پالنے ہی میں مجھے راجہ بن جانے کے خواب دکھانے لگی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔

دروازہ بند نہیں کیا ـــــ بلکہ میری نسوانیت کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ دروازہ جیسے زور سے میری پسلیوں پر آ کے لگا تھا اور میرا دل غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ جب ساری بات میری سمجھ میں آئی تو میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

میں نے اسی انداز میں گاڑی اسٹارٹ کی ـــــ اور گھر کا رُخ کیا ـــــ یقیناً اس لڑکے نے میری بے عزتی کی تھی۔ میرے منہ پر جوتا مارا تھا۔

میں جو پوری یونیورسٹی میں طرم خاں بنی پھرتی تھی اور ہر لڑکے کو روک کر

اس سے مذاق کر لیا کرتی تھی۔ آخر مجھے کیا سوجھی ؟

ایک انتہائی معمولی انسان نے میری عقل ٹھکانے لگا دی تھی۔ میں اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔

شاید مجھے اس لڑکے پر غصہ آ رہا تھا۔

میں جو موتیا گلزار تھی ـــــ اور پاپا نے جسے گلے کا ہار بنا رکھا تھا ـــــ زمین پر یوں اکڑ کر چلتی تھی جیسے یہ زمین میرے پاپا کی جاگیر ہو۔

آج پتہ چلا ـــــ اس زمین پر چلنے والا ہر شخص کیڑا نہیں ہوتا جسے روند دیا جائے۔

گھر پہنچ کر میں غصّے سے کھولتی رہی .... باؤلوں کی طرح اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی ـــــ اپنی بے عزتی کی داستان میں کسی کو سنا بھی نہیں سکتی تھی۔

گرم گرم کڑوی کڑوی کافی بنوا کر پی ـــــ ڈرائنگ رُوم میں بیٹھ کر ہیجان انگیز دُھنیں سنیں ـــــ پھر ایک انتہائی رومانٹک ناول لے کر پڑھنے بیٹھ گئی۔

مگر ناول کے کردار ہمیشہ گڈمڈ ہو جاتے اور میری آنکھوں کے آگے ایک شکل بن جاتی اور میں سوچتی۔

تو ایسے ہوتے ہیں غریب لوگ ـــــ ؟

ہم تو سمجھتے تھے کہ غریبوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مگر غریب لوگوں کو اپنی ذات پر کتنا بھروسہ ہوتا ہے ـــــ اعتماد اور وقار سے بھرے ہوتے ہیں

لوگ ـــــ اتنے حقیقت پسند ہوتے ہیں کہ بڑی خوبصورتی سے منہ پر جوتا مار جاتے ہیں۔ اسی وقت میرا جی کھول اٹھتا۔

اُلّو کا پٹھا ـــــ کسی غلط فہمی کا شکار معلوم ہوتا تھا ـــــ زگسیت کا مریض لگتا تھا۔ میں نے تو کبھی اُس کی شکل بھی غور سے نہیں دیکھی تھی۔ اس کے کپڑوں سے اس کو پہچانا کرتی تھی۔ شبہ وہی نیلی پینٹ اور سفید دھاری دار قمیض ـــــ

تو اپنی غربت پر اُسے غرور بھی ہے ـــــ اور قوّتِ بازو کو آزمانا بھی چاہتا ہے ـــــ

خیر ـــــ خیر ـــــ

غلطی میری تھی۔ آئندہ راہ چلتے کسی کو یوں نہیں چھیڑوں گی۔ ٹھیک کہتے ہیں لوگ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ کئی بار دل چاہا پاپا سے ذکر کیا جائے ـــــ لیکن پھر ذکر کرنے کو دل نہ چاہا ـــــ

سارا دن بوکھلائی بوکھلائی اُلٹے سیدھے کام کرتی رہی اور نوکروں کو ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ کر اپنی ہتک کا بدلہ لیتی رہی۔

رات گئے جب ساری دنیا پر خاموشی چھا گئی۔ اور میں جھنجھلائی سی اپنے خوبصورت بستر پر آ کر لیٹی تو پھر میں نے چھت کو گھورنا شروع کر دیا۔

وہ بدتمیز لڑکا ـــــ چھت پر آ گیا ـــــ

"کیا اس نے میری بے عزتی کی تھی؟" میں نے بڑے نرم لہجے میں اپنے دِل سے پوچھا۔

"نہیں تو ——" میرے دل نے کہا۔

اس نے تمہیں ایک اچھی بات کہی تھی۔ آخر تمہیں اس کے ساتھ مذاق کا کیا حق پہنچتا تھا۔ وہ اپنی راہ پر جا رہا تھا —— تم نے کس مقصد کے تحت اسے روکا تھا —— ؟ ذرا سا مذاق کرنے کے لئے —— مذاق میں اگر وہ سنجیدہ ہو جاتا —— اس کی زندگی کے سارے منصوبے دھرے رہ جاتے اس نے تمہیں جو کچھ کہا بالکل ٹھیک تھا —— سچ کڑوا ہوتا ہے، اس لئے تم اس کے سچ کی کڑواہٹ کو محسوس کر رہی ہو۔ عام لڑکوں کی طرح اگر وہ تمہیں بے وقوف بنانے کے لئے خوشامد شروع کر دیتا —— ہنس کر دو چار باتیں کر لیتا۔ کچھ دُور تمہارے پیچھے جاتا تو کیا تمہیں اچھا لگتا —— ؟

پھر تم اس وقت لیٹی اس کے بارے میں ہرگز نہ سوچ رہی ہوتیں۔

ہاں واقعی —— ؟

مَیں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے جو کچھ کہا وہ سچ تھا۔

اس کے خیالات تو قدر کرنے کے لائق تھے۔ اگر آج ہمارے ہر نوجوان کے ایسے ہی خیالات ہوں تو ہمارا ملک جنّت نہ بن جائے۔

واقعی ——

میں اور بھی چونک گئی۔

کس قدر خوبصورت تھے اس کے خیالات —— جبکہ آج قوم کا ہر نوجوان حسن و

عشق سے آگے سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور یونیورسٹی میں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجنوں اور فرہاد کی ساری نسلیں یہاں آ گئی ہیں۔ لڑکیاں ہیں تو وہ بھی۔ قلوپطرہ بننے کی کوشش میں رہتی ہیں۔ کتنے لڑکے ہیں جو ان فضولیات سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے میں نے اس لڑکے کے سوا کسی کو ایسا نہیں دیکھا تھا۔ پتہ نہیں کون سے ڈپارٹمنٹ کا تھا۔ پتہ نہیں —— اس کا کیا نام تھا۔

اگر کبھی پہلے مل جاتا۔ تو سب اَتہ پتہ کر لیتی۔ اور پُورے دو سال اس پر خُوب ریسرچ کرتی۔ آیا صاحب زادے —— کردار کے بھی غازی ہیں یا صرف گفتار کے دھنی ہیں —— یہ بھی ممکن ہے، وہ کسی اور کے ساتھ پھنسا ہُوا ہو۔ اور مجھ پر جعلی عکس ڈال رہا ہو۔

مگر تھا سب سے عجیب لڑکا ——

ذہن میں رہ گیا ——

اور مجھے یہ سوچ کر تعجب ہُوا کہ میں دوپہر سے اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

بھلا کیوں —— ؟

مَیں نازوں کی پالی، موتیا گلزار —— میں کیا جانوں مرد کیا ہوتا ہے —— ؟

مَیں نے تو آنکھ کھول کر پاپا کو دیکھا تھا —— پاپا ہی ہر مرد کا سمبل بن کر میری نگاہ میں تھے —— مجھے رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ پچھلے دو سالوں سے میرے کئی رشتے آ رہے تھے مگر میں نے پاپا سے صرف ایم اے کرنے کی مہلت مانگی تھی۔

پھر میرا خیال تھا یہ پاپا کی سردردی ہے، کوئی اپنے جیسا مرد ڈھونڈ کر ایک روز

میرا بیاہ رچا دیں گے۔

وہ لڑکا مرد کی صورت میں بار بار میرے ذہن سے ٹکرانے لگا۔

یکایک مجھے احساس ہوا

جیسے میرے پہلو میں ایک چنگاری سی سُلگ اُٹھی ہے اور وُہ شعلہ بن گئی ہے

اس تپش کو میں نے شدت سے محسوس کیا۔

اور اگلے تین دن ——

اُف وہ تین دن، انتہائی اضطراب، بے کلی اور بیقراری میں گزرے۔

واہ !

میں اس لڑکے کے عشق میں مبتلا ہو چکی تھی، جس کے نام کا مجھے علم نہیں تھا، جس کے ماں باپ کو نہیں جانتی تھی جس کا اتہ پتہ معلوم نہیں تھا۔

مگر یہ کیسا عشق تھا —— !

اس میں وصال کی طلب نہیں تھی

اسے ملنے اور بلانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا . . . . اس کے آہنی ارادوں کو بھی توڑنے کی تمنا نہیں تھی۔ بس —— میں اسے اپنے دل کے اندر محسوس کر رہی تھی اور دل کی بات زبان پر لا کر اپنی ہی نظروں میں گرنا چاہتی تھی۔

چنانچہ پورے تین دن میں گھر میں مقید ہو گئی —— عاشقوں کی طرح بستر پر پڑ گئی —— ہر کروٹ پہ منہ سے ایک آہ نکلتی تھی —— لیلیٰ مجنوں کی ساری

کہانیاں سچ نظر آنے لگیں —— بات بات میں رونا آجاتا —— دُرد ناک گیت سُن کر آنسو نکل آتے ——

سارا دن کڑوی کافی پیا کرتی —— اور درد بھرے گیت سنا کرتی —— کبھی ہنس دیتی کبھی رو دیتی۔

پاپا نے سمجھا میں آرام کر رہی ہوں . . . . مگر میں بستر پر پڑی اپنے سرکش جذبوں سے لڑ رہی تھی۔

تین دن کے بعد مجھے افاقہ محسوس ہُوا ——

اور ایک ہفتہ گزرنے تک میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔ یوں جب کافی دن گزر گئے تو مجھے محسوس ہُوا عشق کی وہ لال آندھی جو اُمنڈ گھمنڈ کر چڑھی تھی، ہستی کو تہہ و بالا کئے بغیر آسمان کے سنہری کناروں میں کھو گئی ہے —— اور جاتے جاتے پہلو میں میٹھا میٹھا درد چھوڑ گئی ہے —— تب مجھے اس مصرعے کے معنی خود بخود سمجھ میں آ گئے۔

عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

جوں جوں دن گزرتے گئے —— ایک نیا احساس میرے اندر جاگتا گیا —— یعنی انسان زندگی کی راہ گزر پر کئی لوگوں سے ملتا ہے —— ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، جو چپکے سے آکر من میں بیٹھ جاتے ہیں۔ دِل تو یادوں کا ایک معبد ہے —— اس معبد میں تیز روشنی نہیں جلاتے —— جب بھی سرِ راہ کوئی نئی یاد

ملتی ہے، اس کا بُت بنا کر . . . . اس عبادت گاہ میں رکھ دیتے ہیں . . . . .

کبھی کبھی جب پاپی دُنیا سے جی بیزار ہونے لگے ـــــ تو اس عبادت گاہ میں گھس کر اندر کی تیز روشنیاں جلا لیتے ہیں۔ تب ان یادوں کی صورتیں واضح طور پر نظر آنے لگتی ہیں اور زندگی گزارنے کے لئے یہی کیا کم ہے کہ پہلو میں یادوں کا ایک خوبصورت معبد ہو ـــــ اور احساس کی اگر بتیاں تمنّاؤں کے عنبر و لوبان کے ساتھ سلگ رہی ہوں . . . .

اندر مہک ہو تو زندگی کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔

عشق انسان کو فلسفی بنا دیتا ہے۔

میں زندگی کے ساتھ چل پڑی۔

میرا رزلٹ آگیا۔ اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی۔ پاپا کے پاس اسی زور و شور سے پروپوزل آنے لگے۔ اب کے اُن میں پاپا کا زور بھی شامل تھا۔

وہی مسکراتے ہوئے بنے سنورے لڑکے ـــــ کوئی اپنے باپ کی موٹر پہ آتا۔ کوئی اپنی موٹر پہ ـــــ کسی کے پاس بیشمار سرٹیفکیٹ ہوتے ـــــ اور کسی کے پاس بیرونی ڈگریوں کے انبار۔ کسی کی جائیداد کی لسٹ بھاری ہوتی ـــــ اور کسی کے والد کا انکم ٹیکس ـــــ

مگر کبھی کبھی میں اس غریب آدمی کو ضرور یاد کر لیتی جو کچھ بننے کے لئے ـــــ اس دنیا میں نکل گیا ہوگا۔

میں نے بھی سب کچھ پاپا پر چھوڑ دیا۔

کسی کی بیگم بن کے ہی زندہ رہنا ہو تو پاپا کو کیوں نہ احسان مند کر لیا جائے ـــــ؟

میں نے پھر شہر میں آوارگی شروع کر دی۔ مگر اب میں ہمیشہ ڈرائیور کو ساتھ لے جایا کرتی تھی۔

جب شادی کے نام پر جی میں ہلچل نہ ہو تو پھر شوخ و شنگ لڑکیاں اپنی شادی معاملہ اپنے والدین پر چھوڑ دیتی ہیں۔

ایک شام میں اپنی ایک سہیلی سے ملنے کے لئے اس کے گھر گئی۔ جاتے ہی میں نے موٹر واپس کر دی۔ مگر اندر جا کر پتہ چلا کہ آج ان کے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ سب لوگ کسی شادی پر گئے ہیں۔ نوکر نے مجھے مجبور کیا کہ میں بیٹھ جاؤں۔ مگر مجھے تنہا گھر میں بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔ گھر پر فون نہیں کیا کہ ابھی تو ڈرائیور وہاں پہنچا بھی نہ ہوگا۔ وہاں سے تھوڑی ہی دُور میری ایک اور سہیلی رہتی تھی —— سوچا —— پیدل نکل جاؤں۔ اور اس سے مل لوں۔ وہاں سے گھر فون کر کے ڈرائیور کو وہیں بلا لوں گی۔

اس لئے میں سڑک پر آ گئی۔

کبھی کبھی سڑک پر پیدل چلنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ یہ مزہ ان لوگوں کو آتا ہے جو ہمیشہ موٹر میں سفر کرتے ہیں۔ میں تیز تیز قدم اُٹھاتی چلی جا رہی تھی میری دائیں جانب

ے موٹر، اسکوٹر، رکشا، سائیکلیں سب گزرتے چلے جا رہے تھے۔ بائیں جانب دکانیں
ہیں اور ہر راہ گیر مجھے دیکھ کر کوئی فقرہ چست کر دیتا تھا۔

بہر حال مجھے تو یہ راستہ طے کرنا ہی تھا۔ اس لئے اپنی دُھن میں تیز تیز قدم اُٹھاتی
لی جا رہی تھی کہ ایک اسکوٹر زن سے میرے قریب سے گزر گیا —— پھر تھوڑی
ی دیر بعد جیسے وہ اسکوٹر موڑ کاٹ کر پھر میرے پیچھے آ کر رُک گیا ——

جی کڑا کر کے چلتی رہی اور کسی فضول حرکت کی منتظر رہی۔

وہ بائیں جانب سے چلتا ہوا قریب آ گیا۔ مَیں نے دانستہ اس کی طرف
نہیں دیکھا۔ سامنے دیکھ کر قدم تیز کر دیئے۔

وہ قریب آ کر بولا "حیرت ہے آج موٹر والے پیدل چل رہے ہیں ——"

مَیں نے غصے سے اس کی جانب دیکھا اور میرا اُٹھا ہوا ہاتھ گر گیا۔

یہ تو وہی لڑکا تھا ——!

میرا دل ذرا سا بے قابو ہوا —— پھر میں نے اُسے پہلو میں تھام لیا۔ عشق
کا ڈائیٹیشن دو گزر چکا تھا —— کوری صراحی کو بھٹی میں ڈالو تو پختہ ہو جاتی ہے۔ اس
لئے مُسکرا کر بولی۔

"کیوں —— کیا سڑکوں پر پیدل چلنا بھی غریبوں کی اجارہ داری ہے"

"نہیں —— میں نے یہ تو نہیں کہا ——" وہ ہنس کر بولا۔

"میرا خیال ہے، چلنا زندگی کی علامت ہے۔ کسی راہ چلتے کو دیکھ کر رُکنا

نہیں چاہیے"۔ میں نے اُس دن کا بدلہ لیا۔

اُس نے میرا طنز پا لیا تھا۔

کھسیانی سی ہنسی ہنسا اور بولا۔

"میں نے سوچا قرض اتار دوں۔ اُس دن آپ نے مجھے لفٹ دے کر امتحان میں پاس کرا دیا تھا۔ آج میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ تاکہ قرض اتر جائے۔ غریب آدمی قرض کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ——!"

"اچھا تو آپ کامیاب ہو گئے ——" میں نے شائستگی سے کہا —— "ویسے آپ کے طور طریقے بھی کامیاب ہونے والے ہیں"۔

میں نے دیکھا آج اُس نے ہمیشہ والے کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھے۔ سفید ٹائٹ جینز کے ساتھ مکھن کی طرح سفید جالیوں والی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی جس کا گلا سینے تک کھلا ہوا تھا۔ اُس میں سے اُس کا کشادہ سینہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر صحت اور طمانیت کا خون تھا اور مسکراتا ہوا وہ بڑا دلکش لگ رہا تھا۔ اُس کی ذہین آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ سانولے رنگ اور سادگی کے باوجود وہ انتہائی خوبرو لگ رہا تھا۔ یا مجھے دکھائی دیا۔

میں نے کہا "بس دو چار قدم پر میری سہیلی کا گھر ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔ یوں بھی مجھے اسکوٹر کے پیچھے بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا ہے"۔

"موٹر والوں کو کم اتفاق ہوتا ہے اسکوٹر پر بیٹھنے کا"۔

"نہیں دو تین بار ہوا تھا اتفاق —— مجھے ایسے لگتا ہے۔ اسکوٹر آگے نکل جائے

اور میں کہیں راستے میں گر جاؤں گی"۔

"اگر آپ مجھے پکڑ لیں گی تو پھر نہیں گریں گی"۔

"پھر آپ کو شکوہ ہو گا کہ میں نے سرِ راہ آپ کو پکڑ رکھا ہے"۔

جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا —— میرا بھی منہ سُرخ ہو گیا اور اس کا بھی۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم دونوں بولنے کے قابل نہیں رہے۔ اور ایک خوبصورت سی چغل خور سی خاموشی ہمارے درمیان چھا گئی۔

اُس نے جیب سے سگریٹ نکالے —— اور ایک سگریٹ سلگا کے پینے لگا —— دو تین کش لے کر اُس نے اپنی پیشانی کا پسینہ صاف کیا اور بولا۔

آپ کا حافظہ اچھا ہے۔ ویسے ایک اور تجویز بھی ہے"۔

"وہ کیا ——؟" میں نے پوچھا۔

"آپ اسکوٹر چلائیں۔ میں پیچھے بیٹھ جاتا ہوں"۔

میں نے اس کی طرف اچنبھے سے دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔

"آپ کو پکڑوں گا نہیں اور گروں گا بھی نہیں"۔

میں ہنس پڑی۔ وہ بھی ہنس پڑا۔

"میرا خیال ہے۔ آپ جیسا جیالا نوجوان ایسی سواری پر بیٹھنا پسند نہیں کرے گا۔ جس کی مہار ایک عورت کے ہاتھ میں ہو"۔

"یہ بھی آپ نے ٹھیک کہا"۔ وہ دوبارہ ہنسا۔

"آپ خاصی ذہین خاتون ہیں۔ عام طور پر کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیاں بور ہوتی ہیں۔ اُن میں تپش نہیں ہوتی۔"

"بڑا تجربہ ہے۔"

"یونیورسٹی ہی میں دیکھا ہے۔"

"اچھا ——" وہ ایک دم بولا "میں آپ کے ساتھ تو چل سکتا ہوں۔ یعنی آپ کو وہاں چھوڑ دوں —— جہاں تک آپ کو جانا ہے ——" پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں وہ خود ہی بولا "ذرا دیکھیں اردگرد کا کیا عالم ہے —— یہاں آپ کا پیدل چلنا ٹھیک نہیں۔"

میں کچھ نہیں بولی تو اُس نے پوچھا۔

"کیا آپ میرے ساتھ چلتے ہوئے ڈرتی ہیں؟"

"ڈر کس بات کا؟"

"کہیں کوئی دیکھ نہ لے ——"

"کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہوگا۔ کوئی ہمارے دل میں چور ہے ——"

اس نے میرے ساتھ چند قدم چلنے کی اجازت مانگی تھی . . . اور عجیب بات یہ ہوئی کہ ہم ساری شام چلتے رہے۔

میری سہیلی کا گھر جانے کہاں رہ گیا تھا۔ باتوں باتوں میں پتہ ہی نہ چلا کہ ہم کتنا راستہ طے کر آئے ہیں۔

گھڑی دیکھ کر میں نے کہا۔

"اب مجھے گھر جانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو ڈرائیور خالی گھر چلا جائے اور پاپا مجھے نہ لے کر پریشان ہوں۔"

"اس باغ سے ہو کر نکلیں —— آپ کے گھر کی طرف یہ راستہ جلدی لے جائے یعنی شارٹ کٹ ہے۔"

ہم ادھر کو ہو لئے۔

چلتے چلتے میں نے پوچھا۔

"آپ کے کیریئر کا کیا بنا؟"

بولا "میرے ابا جی کا ایک چھوٹا سا کیمسٹ اسٹور ہے۔ اس چھوٹی سی دوکان دوائیاں بیچ کر انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے وہ چاہتے ہیں۔ اب میں اتنا بڑا بن جاؤں کہ میرا اپنا دوائیوں کا کارخانہ ہو۔ میں نے ایم فارمیسی کر لیا ہے اور مجھے دوائیوں کی ایک غیر ملکی فرم میں نوکری بھی مل گئی ہے مگر یہ میری منزل نہیں ہے —— مجھے ابھی بہت آگے جانا ہے —— اپنے والد کے خواب کو پورا کرنا ہے ——"

میں خاموش رہی . . . اصل میں مجھے یہ پتہ بھی نہیں تھا۔ اس موقع پر کیا کہنا چاہیئے۔ اب ہم باغ کے وسط سے گزر رہے تھے —— اردگرد پھولوں کی خوشبوئیں پھیلی تھیں۔ لیموں کے پیڑ پر غنچے تھے اور بیلا کی کلیاں مسکرا رہی تھیں۔

میں نے آہستہ سے کہا۔

"آج میں نے آپ کو روکا نہیں تھا۔ اس لئے آپ مجھے بُرا بھلا نہیں کہیں"
"روکا تو میں نے بھی آپ کو نہیں ——" وہ مسکرا کر بولا۔ "صرف آپ کے
ساتھ چلنے لگا ہوں۔"
میرا دل دھڑکنے لگا۔
"تھوڑی دُور چلا ہوں تو ——" وہ رُکا —— اور پھر بولا۔ "یہ
ساتھ اچھا لگنے لگا ہے۔ ایک ذہین اور حسّاس خاتون ہمسفر ہو تو کیریئر بنانے میں
آسانی ہوتی ہے۔"
میں نے یوں چونک کر اس کو دیکھا۔ جیسے انجانے میں کانٹا چبھ گیا ہو۔
اُس نے دھیرے سے میرا ہاتھ تھام لیا۔
اُس کا ہاتھ گرم تھا اور میرا ٹھنڈا۔
شام اور رات گلے مل رہے تھے ——
اور میں نے گھبرا کر کہا ——
"میں اسکوٹر پر بیٹھوں گی۔ آپ مجھے میرے گھر چھوڑ دیں۔"
میں نے اسکوٹر پر بیٹھتے ہی پیچھے سے اس کی قمیص کو پکڑ لیا۔ چند منٹوں میں میں اپنے
گھر کے باہر تھی۔
جب میں چھلانگ لگا کے اُتری تو وہ بولا۔
"یاد رکھئے گا آپ نے مجھے پکڑ لیا تھا۔"

"مگر اب تو چھوڑ دیا ہے ——"
"چھوڑنا عورت کا مسلک نہیں ——"
اُس نے پاؤں مار کر اسکوٹر اسٹارٹ کیا۔ . . . اور بلند آواز سے بولا۔
"مگر میں ہمیشہ اپنے اوپر آپ کے ہاتھوں کی گرفت محسوس کرتا رہوں گا ——"
وہ چلا گیا ——
اور میں حیرتوں کے جنگل میں، واہموں کی جوگن بنی کھڑی رہ گئی۔
دوسرے دن علی الصبح اس نے فون کیا اور بولا۔
"میرا نام حسین ہے ——" غلام حسین آفاقی —— "گو نام سے کوئی
ق نہیں پڑتا —— اصل بات پہچان کی ہوتی ہے۔ جہاں جان پہچان پہلے ہو
ائے —— وہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی لیکن جب آپ مجھے بلانا چاہیں
ں تو کیا کہہ کر بلائیں گی۔ اس خیال سے سوچا اپنا نام ہی بتا دوں ——"
میں تھوڑی دیر گم صم کھڑی رہی۔
"آپ کا خیال ہے میں آپ کو بلانا چاہوں گی؟" میں نے مری ہوئی آواز
میں کہا ——
"آپ کا دل بلانا چاہے گا ——"
"اگر آپ دل کی آواز پر یقین رکھتے ہیں تو پھر نام بتانے کی زحمت کیوں
کی —— دل کو پکارنے کا ڈھنگ آتا ہے۔"

"وہ کس طرح ——— ؟"

"آپ نے فون کر کے ثابت کر دیا۔"

اب گم صم ہونے کی اس کی باری تھی۔

کچھ دیر ہم دونوں ریسیور تھامے بس ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز سنتے رہے۔

یہ تعلق بھی کیا عجیب چیز ہوتے ہیں ——— برقی رَو کی لہریں ان کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں۔ کوئی فون، کوئی تار، کوئی خط ——— کوئی زبان ایک دوسرے سے وہ نہیں کہہ سکتی جو اس خاموشی میں ہم نے ایک دوسرے سے کہہ دیا تھا ——— جی چاہتا قیامت تک یونہی فون تھامے کھڑے رہیں۔ چُپ گپ ——— منتشر منتشر ——— ہراساں ہراساں ———

بہت دیر کے بعد میں نے مدھم آواز میں پوچھا "تو آپ نے فیصلہ کر لیا؟"

وہ بولا۔ "ہو ہی گیا ——— ہونی ہو کر رہتی ہے بھلا منہ زور سیلاب بھی کسی بند سے رُکتا ہے!"

"مگر ———"

وہ جلدی سے میری بات کاٹ کر بولا "میں نے آج تک کوئی غلط فیصلہ تو نہیں کیا۔ اپنی پہچان پر ناز بھی ہے مجھے۔ وقت کی مہربانی پر بھی یقین رکھتا ہوں۔ اگر آپ وہ ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ تو مجھے زندگی کی ابتدا ہی آپ کے نام سے کرنی پڑے

گی ——— اور پھر آپ میری زندگی کو انتہا پہ پہنچائیں گی۔

دیکھیں تو اس ستمگر کا حال ——— اس نے چند لفظوں میں مجھے لوٹ لیا۔

میں نے ایک فیصلہ کُن انداز میں صرف اتنا کہا۔

"میرا نام موتیا ہے ——— موتیا گلزار ———"

وہ ہنس کر نشے کے سے انداز میں بولا ———

"تمہیں معلوم ہے موتیا کے پھول بستر کے سرہانے ہی اچھے لگتے ہیں۔"

پاپا پر میری کوئی دلیل کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ پاپا کا تو یہ عالم تھا۔

"جو نہیں کہیں تو نہیں رہے۔ کسی التجا پہ بھی ہاں نہ ہو"

وہ حیران تھے۔ میں لائق فائق ـــــ صاحب جائیداد۔ نامور اور اُونچے خاندان کے سبھی لڑکوں کو ٹھکرا کر ایک کیمسٹ کے بیٹے سے کیوں شادی کر رہی ہوں۔ مَیں نے پاپا کو حسین سے ملوایا۔ اور ان کی ایمان دارانہ رائے پوچھی۔

پاپا بڑے دیانت دار آدمی ہیں۔

وہ حسین کی ذہانت اور قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی کہہ دیا کہ "اس لڑکے میں آگے بڑھنے کی بے شمار صلاحیتیں ہیں ایک دِن بہت بڑا آدمی بن جائے گا" پھر بھی میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے سے گریزاں رہے۔

"کیوں پاپا کیوں ـــــ؟"

"بیٹی تم ان معاملوں کو نہیں سمجھتی ہو ـــــ AMBITIOUS آدمی ایک آگ کی مانند ہوتے ہیں۔ اُن کے قریب جو چیز جاتی ہے وہ جل جاتی ہے۔ اپنے کیریر اور مستقبل کے سامنے وہ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے اور جو عورت اس طرح ان کی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے وہ اسے جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ انہیں مخلص عورت کی ضرورت ہوتی ہے مگر وہ عورت تم ہی کیوں بنو ـــــ؟"

"پاپا ـــــ میرے لئے تو یہ بڑے فخر کی بات ہوگی۔ اگر میں کسی انسان کو ایک خوبصورت مستقبل دے سکوں گی۔ مجھے کتنی خوشی ہوگی میں دیکھوں گی، اس پودے کو میں نے اپنے خون سے سینچا ہے"

"بیٹی ـــــ تمام آئیڈیالسٹک لڑکیاں ایسا سوچ لیتی ہیں۔ مگر پھر زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تمہیں کیا علم کہ یہ سیلف میڈ آدمی کیا ہوتے ہیں۔ یہ زندگی بھر زمانے سے لڑتے ہیں۔ سب کچھ اپنی قوت بازو سے حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے جسم اور رُوح پر بے شمار خراشیں ہوتی ہیں۔ ان کا بدلہ اس عورت سے چکاتے ہیں۔ جو ان کی زندگی میں آجاتی ہے۔ اس کی قیمت وہ عورت ادا کرتی ہے جو اُن سے محبت کرتی ہے۔ یہ زمانے کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور وہ عورت ان کے ظلم و ستم سہتی ہے ـــــ اگر افسانوی انداز میں سوچا جائے تو یہ ایک خوبصورت

کہانی اور ایک دلآویز جذبہ محسوس ہوتا ہے ـــــ مگر تمہاری ساری زندگی کا سوال ہے ـــــ ساری زندگی اپنے آپ سے لڑتی رہو گی۔ تمہاری پرورش بڑے خودمختارانہ انداز میں ہوئی ہے۔ دو خودمختار اور ضدی آدمی جب ایک دوسرے سے مسلسل ٹکراتے رہیں تو گھر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

"مجھے صرف ایک بات کا ڈر ہے ـــــ" پاپا خاموش ہو گئے۔

"کس بات کا پاپا ـــــ؟"

"کہ کہیں تم آدھے راستے میں ہی تھک کر نہ لوٹ آؤ۔ یہ صدمہ میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ عورت کی زندگی بار بار اس تجربے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

شادی کے دس بارہ سالوں میں عورت کو اپنے گھر میں تناور درخت کی مانند جڑوں تک اُتر جانا چاہیے اسی طرح بہترین نسلیں بنتی ہیں

اگر پوری ازدواجی زندگی عورت اس کمزور پودے کی مانند گھر کے صحن میں ڈولتی رہے جس کو ہوا کا تیز و تند جھونکا کسی وقت بھی اکھیڑ کر پھینک سکتا ہو ـــــ تو اُس عورت نے زندگی میں کیا حاصل کیا ـــــ؟"

"پاپا ـــــ آپ نے بہت خوبصورت باتیں کہیں اور میں نے اُن کو پلو سے باندھ لیا۔

پاپا ـــــ مجھے طوفانوں سے کھیلنے کی اجازت دیں۔

پاپا ـــــ مجھے اپنے جذبوں کو آزمانے دیں۔

پاپا ـــــ میں زمین ہوں . . . . وسیع و عریض . . . . میں کھیتی ہوں۔ سونا اُگلنے والی ـــــ پاپا میں پھلوں سے لدی ڈال ہوں ـــــ پاپا مجھے کسی کے کام آنے دیں ـــــ پاپا زمین کا دل بڑا ہوتا ہے۔ زمین کا حوصلہ بڑا ہوتا ہے۔ پاپا کھیتی کے سینے پر ہمیشہ وزنی ہل چلایا جاتا ہے، تب وہ نعمتیں اُگلتی ہے۔ پاپا میرے پاس حوصلہ ہے۔ ہمت ہے۔

محبت ہے ـــــ

پاپا میں گھر کے آنگن میں گڑا ہوا تناور درخت بن کے دکھاؤں گی پاپا ـــــ جس کی جڑیں زمین میں سرطان کی طرح اُتر جاتی ہیں کہ کوئی انہیں اکھاڑ بھی نہیں سکتا۔ پاپا آدھے راستے سے لوٹ کر نہیں آؤں گی۔ میں نے لوٹ کر آنا نہیں سیکھا۔ حالات کا رُخ پھیرنا سیکھا ہے۔

اور پاپا اس سیلف میڈ بڑے آدمی کے پیچھے تمہیں ہمیشہ ایک عظیم عورت نظر آئے گی۔ جو گمنام تھی۔ گمنام رہی۔ مگر جس کا ایندھن کام آیا۔

پاپا تم جوانی کے منہ زور جذبوں کا مذاق اڑاتے ہو۔

آخر مرد دنیا میں کس لئے پیدا کئے گئے . . . . . زمانے سے لڑنے کے لئے ـــــ اور عورتیں اس لئے بھیجی گئیں کہ ان پر اپنی محبت اور رفاقت کی چھایا رکھیں۔ حالات کی کڑی دھوپ میں، مرد کو عورت کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں کی ضرورت ہوتی ہے پاپا ـــــ!"

شادی کی پہلی رات ہم نے آئندہ زندگی کا منصوبہ بنایا ——

ہمارا ہر منصوبہ فاصلوں سے جا ملتا تھا —— مگر ہم نے بڑے خلوص سے زندگی کی ابتدا کر دی۔

بہت مزہ آتا ہے کسی بہت بڑی مہم کو شروع کر کے۔

بہت اچھا لگتا ہے —— مستقبل کے خاکے بنانا ——

بہت خوبصورت لگتا ہے، وعدے کرنا، قسمیں کھانا، جان پر کھیل جانے کی باتیں کرنا ——

ہے نا —— ؟"

کرسی پر سوئی سوئی موتیا چونک اُٹھی۔ جھنجھلا کر جاگ گئی اور جیسے شوخ و چنچل موتیا کھڑکیوں دروازوں کی راہ —— چاندنی کی طرح باہر اُتر گئی۔

جانے موتیا کی آنکھ کیسے لگ گئی تھی۔

اُس نے چونک کر گھڑی دیکھی —— پچھلے پہر کے تین بج رہے تھے —— جانے لب سارے مہمان گئے —— گھر پر سناٹا تھا —— اُس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر کو جھانکا۔ آسمان پر ستارے بکھرنے والے تھے —— صبح سے پہلے ستاروں کا نور یونہی بکھرنا شروع ہو جاتا ہے۔

موتیا نے کھڑکی بند کر دی اور باہر نکل کر ثانی کے کمرے میں چلی گئی.... اُس کی عادت تھی۔ رات سونے سے پہلے ایک بار ثانی کے کمرے میں ضرور جایا کرتی تھی۔ ثانی اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور اب اس کی عمر بارہ سال تھی۔

موتیا نے دیکھا ثانی بے سُدھ سو رہا تھا۔ اُس کی کتابیں اور لیگو سیٹ آس پاس بکھرے پڑے تھے اور بتی جل رہی تھی۔ موتیا نے اس کی تمام چیزیں سمیٹ کر ایک جگہ رکھ دیں۔ بتی بجھائی۔ دروازہ آہستہ سے بند کر دیا اور نیچے اُتر گئی —— ملازم تھک کر سو چکے تھے اور سارا گھر اُونگھ رہا تھا مگر گھر کی ساری بتیاں جل رہی تھیں کس قدر غیر ذمہ دار ہوتے ہیں —— یہ ملازم۔ وہ سوچنے لگی —— نہ ساری بتیاں بند کیں نہ دروازے —— خیر —— یہ کام اُس نے خود کیا —— اور اوپر اپنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ بیڈ روم سے گزرتے وقت اس نے دیکھا حسین ابھی جاگ رہا تھا۔ سائیڈ ٹیبل کا لیمپ جلائے کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔

وہ کپڑے بدل کر باہر نکل آئی۔

"موتیا ——" حسین نے اُسے آواز دی۔
موتیا ——"
حسین نے اُسے پکارا تھا ——؟

جب کوئی جواب نہیں ملا —— تو حسین نے پلٹ کر دیکھا۔
وہ ہوا کے بن آواز جھونکے کی مانند کمرے سے نکل گئی تھی۔۔۔۔
حسین ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتا رہ گیا اور اُٹھ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔؟
"ہاں تو جناب حسین آفاقی صاحب کیا حال ہیں؟"
ایک شریر سا آدمی کھڑکی میں سے کُود کر اس کے سامنے آ گیا۔
بہت ٹھیک ہوں —— بہت خوش ہوں —— اللہ کا احسان ہے ——؟"
تو یہ آنکھیں ذرا جھکی جھکی کیوں ہیں ——؟
نہیں تو ——
حسین نے خود اپنے آپ سے نگاہ چُرالی۔
"پتہ نہیں کیا شے ہوتی ہے جو چھن سے ٹوٹ جاتی ہے ——"
میں رو دادِ سفر ہوں ——
کھڑکی کے پار کسی نے ہاتھوں سے دستک دی۔
ٹھیک ہی تو ہے۔ مرد کی زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ عورت کہہ سکتی ہے کہ وہ شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کو بھیجی گئی۔ مگر مرد یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس

زمین پر وہ اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا —— تو پھر اس تخلیق کی ہوئی کائنات کو اور وسیع کرنا اور خوبصورت بنانا مرد کا فرض ٹھہرا —— میں محبتوں کو راہ کی رکاوٹ بنانے کا قائل نہیں تھا —— اسی لئے میں نے موتیا کا انتخاب کیا۔

موتیا ایک اُونچے گھر کی لڑکی تھی۔ بچپن سے اس نے پیٹ بھر کر روٹی کھائی تھی۔ حسب منشا کپڑا پہنا تھا۔ ایک آزاد ماحول میں، ایک با اعتماد زندگی گزاری تھی —— والد نے اُسے وہ سب دیا تھا، جس کی اُسے ضرورت تھی۔

ایسی لڑکیاں خوبصورت بیویاں بن جاتی ہیں کہ اُن کے چہرے پر بچپن کی محرومیوں کی خراشیں نہیں ہوتیں ورنہ تو وہ اپنے احساسِ کمتری کے ناخن مار مار کر اچھے خاصے مرد کا حلیہ بگاڑ دیتی ہیں —— یہ نہ کرو —— وہ نہ کرو۔ اِدھر نہ دیکھو —— اُدھر نہ جاؤ۔

مریض عورتیں مرد کا کیریئر تباہ کر دیتی ہیں۔

مجھے صحت مند دل و دماغ والی عورت کی ضرورت تھی —— وہ تو اللہ کا شکر ہوا کہ مجھے اس عورت سے محبت بھی ہو گئی ——

لیکن محبت کا مطلب عورت اور مرد کی نظر میں مختلف ہوتا ہے ——

مرد کہتا ہے اگر عورت مجھ سے محبت کرتی ہے تو کچھ طلب نہ کرے بس محبت کئے جائے۔

نہ صرف یہ کہ محبت کئے جائے —— بلکہ قربانیاں بھی دیئے جائے ——

مرد عورت کے ایثار کو محبت کہتا ہے ——
عورت مرد کے پیار کو محبت کہتی ہے ——
مرد عورت پر زیادہ سے زیادہ بوجھ لادنا چاہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ
بوجھ ڈالنے اور اُف نہ کرنے کو وہ محبت کہتا ہے۔
عورت مرد کی ذرا سی توجہ کو محبت کہتی ہے۔
مرد دُور دُور بھاگنے کو محبت کہتا ہے۔
عورت قدموں میں رہنے کو محبت کہتی ہے۔
مرد محبت کرنے کے باوجود اس فضا میں پرندے کی مانند آزاد اڑنا
چاہتا ہے۔
جبکہ عورت اپنا آپ محبت کی آہنی زنجیروں میں لپیٹ دینا چاہتی ہے۔
عورت لپٹ جانا چاہتی ہے ——
مرد جھٹک دینا چاہتا ہے ——
عورت جس مرد کو حاصل کر لیتی ہے —— اس کی زندگی اسی کے محور
کے گرد گھومنے لگتی ہے ——
مرد جس عورت کو حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اس کی نظروں میں بے مول
ہو جاتی ہے ——
مگر میرا نظریہ اس سے مختلف تھا۔

میں محبت اور شادی کو پاؤں کی زنجیر نہیں سمجھتا تھا۔ میرے خواب میرے
آدرش —— میری ماں کی لوریاں —— میرے باپ کی مفلسی ہمہ وقت میرے
لاشعور میں رہتی تھی ——

ہاں زندگی کا اعتماد اور ایندھن میں نے موتیا سے حاصل کرنا چاہا —— موتیا
ماتر عورت کا دل گئی۔ وسیع، بیکراں —— بے لوث ——

اور شادی کے ایک مہینہ بعد میں اُسے چھوڑ کر دوسری دنیاؤں کی طرف سدھارا۔
کیونکہ اپنے استھان پہ بیٹھ کے کسی آدمی کے وزن کا احساس نہیں ہوتا —— انسانوں
کے اکھاڑے میں نکل جانے سے معلوم ہوتا ہے —— کہ کون کتنا طاقتور ہے ——
کون شہ زور ہے —— اور کون کمزور۔
میں بھی اپنے وطن سے چلا گیا
دیارِ غیر میں —— اگر میرا کوئی آسرا تھا۔ تو موتیا کے خطوط —— وہ خطوط
آگ سے بھرے ہوتے —— کہ بیٹھے بیٹھے میرا پہلو جل اُٹھتا —— میں نے ان خطوں
کو اتنی بار پڑھا ہے کہ مجھے ایک ایک لفظ ازبر ہے —— کبھی خوش ہو کر اور کبھی
ناراض ہو کر میں اُسے عجیب و غریب جواب دیتا تھا
کبھی کبھی مجھے موتیا کے خطوط بیکل کر دیتے تو میں اُسے ڈانٹ دیا کرتا۔ غصّے
میں جو بھی دل میں آتا، لکھ دیتا ——
ایک بار اس نے لکھا تھا ——

"پاپا کہتے تھے ——— یہ سیلف میڈ آدمی سنگلاخ اور کھُردری زمین کی مانند ہوتے ہیں ——— ایسی زمین مضبوط ہوتی ہے۔ اسے کوئی پامال نہیں کر سکتا۔ مگر اس زمین کے اندر کوئی نیا پودا بھی نہیں اُگ سکتا ———"

"حسین پاپا نہیں جانتے ——— اس کھُردری اور سنگلاخ زمین کے اندر صرف مونیا کا پودا اُگ سکتا ہے ——— اُگا ہے اور مہک رہا ہے ———"

میں نے لکھا تھا!

"مونیا! تم ایسے خطوط لکھو گی تو میں زیادہ دیر تک زندہ رہوں گا۔"

اُس نے لکھا تھا:

"وقت نہیں گزرتا حسین! عمر کے تقاضے تنگ کرتے ہیں۔ اور تنہائیوں کے پھن سر اٹھاتے ہیں۔ میں پاپا کے ہاں بالکل نہیں جاتی۔ وہ میرے چہرے سے میرے دِل کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا:

"چہرے کو دل کا آئینہ بنا لو مونیا! اتنی سچی اور صاف نظر آؤ کہ جب کوئی تمہیں دیکھے اس میں میری شبیہہ نظر آئے ———"

ایک بار اس نے لکھا تھا:

"حسین! میں نے یہ کب کہا کہ میں انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ کہیں انتظار میری عادت نہ بن جائے۔ عادت نس نس میں رچ بس جاتی ہے۔ پھر تو ایسا

تا ہے کہ تمنا پُوری بھی ہو جائے تو ایک انتظار سا رہتا ہے۔ اس کے پُورا نہ ہونے انتظار ——— !"

میں نے جواب میں لکھا:

"انتظار زندگی کا جھُومر ہے مونیا! جو لوگ کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ وہ اپنی د گی ضائع کر دیتے ہیں۔"

اس نے لکھا!

"دِل ایک ہرا جنگل ہے حسین ——— شام ہوتے ہی درختوں کے سائے لمبے جاتے ہیں ——— اور گھُور اندھیرے میں رستہ نظر نہیں آتا ——— میں اِک اِک رش پر اِک اِک دیا جلا کے رکھ چھوڑتی ہوں ——— کہیں تم آؤ ——— اور تمہیں ستہ نظر نہ آئے۔

جانتے ہو یہ دیئے میرے آنسوؤں کے ہوتے ہیں۔"

"پاگل ہو تم ———"

مجھے اس کے خط پر غصہ آگیا۔ میں نے لکھا۔

"آنسوؤں کے دیئے جلانا بزدلی ہے ——— خوشی کی طرح میرا انتظار کرو۔ ام عورت کی طرح عام ہتھکنڈے استعمال نہ کرو۔"

پھر اس نے ایک بار لکھا:

"میرا دل چاہتا ہے۔ اس مہینے تم آجاؤ حسین! ——— اب یہ مت کہنا

کہ میں عام عورت والی باتیں لکھتی ہوں۔ مگر ـــــ درد و کرب کے ان لمحوں میں
جب عورت تخلیق کے مرحلے سے گزر کر دنیا کے بڑے ستون پر کھڑی ہو جاتی ہے۔
میرا جی چاہتا ہے ـــــ تم میرے قریب رہو۔ میرے دل کے قریب ـــــ
اپنی زندگی کی پہلی خوشی کی ـــــ پہلی آواز ہم ایک ساتھ سنیں ـــــ"
میں نے جواب دیا ـــــ!
"واہ میری اچھی بیوی! وہی عورتوں والی بات کر گئیں نا تم۔ یہ بات تو ہر عورت
اپنے شوہر سے کہتی ہو گی۔ کاش تم نے وہ بات کہی ہوتی جواب تک کسی بیوی نے
کسی شوہر سے نہیں کہی ـــــ"
بہت دنوں کے بعد اس کا خط آیا۔ لکھا تھا:
"تو نہیں آیا وفا دشمن تو کیا ہم مر گئے؟
چند دن تڑپے مگر آخر قرار آ ہی گیا!
قرار آتے ہی تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ ایسے میں مَیں کوئی
مختلف بات کہوں ـــــ سو ـــــ تمہارے قرب کی تمنّا نہیں کی۔ ایک
ننھا سا خوبصورت وجود میرے پہلو میں آیا ـــــ تو میں اپنی ساری محرومیاں بھول گئی۔
میں نے اُسے غور سے دیکھا ـــــ تو وہ تمہارا دوسرا جنم تھا۔ تب سے میں نے
اس کا نام "ثانی حسین" رکھ دیا ہے ـــــ تمہیں پسند آیا ـــــ
مجھے موتیا کے جذبوں پر ٹوٹ کر پیار آیا ـــــ اور میں چند دنوں کی چھٹی لے کر اُس

کے پاس پہنچ گیا ـــــ
موتیا کا قرب ایک گھنے سایہ دار درخت کی مانند تھا۔ جب تک میں اس کے
قریب رہتا ـــــ یہی محسوس ہوتا ـــــ ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کر رہا ہوں۔
وہ صرف محبت کرنا جانتی تھی ـــــ
اُس کو معلوم تھا تھکے ہوئے مرد کو تھپکیاں دے دے کر کیوں کر سُلاتے ہیں ـــــ؟

میں جب واپس آ گیا ـــــ تو اُس کا خط آیا :

"حسین! اس بار تمہارے جانے کے بعد، تمہارا جانا اور بھی بُرا لگا۔ وصل کے بعد جُدائی بھیانک لگتی ہے یوں لگتا ہے، ایک خواب دیکھا تھا مگر ایک حقیقت بھی ہے۔ جُدائی کے بعد وصل کتنا خوبصورت بن جاتا ہے۔ بالکل نوعمری کے خوابوں کی طرح ـــ یہ کچھ وہی لوگ جانتے ہیں ـــ جن کے محبوب دور دیس میں رہا کرتے ہیں ـــ اور جن کی چوکھٹ پر ہر شام ایک دیا جلتا ہے۔

میں کب تک خواب دیکھوں گی ـــــ

اور تم کب تک آؤ گے ـــــ ؟"

میں نے جواب میں لکھا :

"موتیا! قرب محبت کو فنا کر دیتا ہے۔"

دُوری محبت کو دوام بخشتی ہے۔ تم نے بھی محسوس کیا ـــ اور میں نے بھی ـــ

آج بھی ہم ایکدوسرے کو اسی شدّت سے محسوس کر رہے ہیں ـــ اسی شدّت سے چاہ رہے ہیں ـــــ"

دن پر دن اور سال پر سال گزرتے رہے ـــــ اور وہ مجھے اس قسم کے خط لکھتی رہی۔

"حسین! کبھی تم نے بارش کے بعد کسی نشیب والی جگہ پر جمع شدہ پانی کے اوپر بجتی ہوئی جلترنگ سُنی ہے؟

جمع شدہ پانی پر اوپر سے آتا ہوا ہر قطرہ جلترنگ سی بجاتا ہے ـــ دراصل یہ جلترنگ نہیں ہوتی ـــــ بچھڑے ہوئے قطرے کی فریاد ہوتی ہے ـــ ؟

میرے سرہانے ارمانوں کا جمع شدہ پانی ـــ حسرت کی ایک ایک بوند کے ساتھ ہر رات ایسی ہی جلترنگ بجاتا ہے۔

اور یہ جلترنگ سنتے سنتے میں سو جاتی ہوں ـــ پھر ایک دن یہ جلترنگ ایک فلسفے کا رُوپ دھار لیتی ہے ـــــ"

حسین!

رات چاند میرے تکیے پر جھک آیا تھا ـــ میری پلکوں پر تھا ـــ میری آنکھوں پر ـــ میری باہنوں میں تھا ـــــ

رات چاند کی چودھویں تھی۔ میں نے اپنے سرد بستر پر سفید ـــ چادر بچھائی تھی

اور اس پر موتیا کے تازہ پھول ڈالے تھے۔ موتیا کی مہک بڑی ظالم ہوتی ہے ——
تم نے کہا تھا ——
ہے نا —— ؟
میں حیران ہوں۔ اب تک تمہیں اس مہک نے ڈسا کیوں نہیں —— ؟"

اس کے بعد میں نے اُسے خط ڈانٹ کے لکھا —— ان دِنوں میرے امتحان ہونے والے تھے —— اور وہ ایسے ایسے خط لکھ کر مجھے تنگ کر رہی تھی۔

جواب میں اس نے لکھا :

حسین !
"میں نہ فلسفی نہ پیغمبر کہ راہ بتلاؤں ؟"
مجھے کیوں دھمکاتے ہو ——
کہو گے تو چپ ہو جاؤں گی۔

اس عمر میں چپ ہونا اچھا نہیں ہے۔ چپ ہونے کے ڈانڈے کہیں دُور جا کر جنگل کے ویران راستوں سے ملتے ہیں۔ جہاں سرمئی شام میں شفق زمین و آسمان کا ملاپ دیکھتی ہے اور لہو بن کے بکھر جاتی ہے۔

اس کائنات میں اور بھی بہت کچھ ہے —— ؟
جو سُنائی نہیں دیتا ——
اگر زمین پہ دلکشی نہ رہے۔ تو آدمی آسمان کی جانب دیکھنے لگتا ہے —— فضا

میں کچھ ایسی شے ضرور نظر آجاتی ہے جو زمین سے بے نیاز کر دیتی ہے ——
میرے اندر موتیا کی مہک ابھی ہے ——
میں اسی مہک میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔
لوٹ آؤ ——"

موتیا کا یہ خط پڑھ کر میں کانپ اٹھا اور مَیں نے لکھا۔

"موتیا! آج کل تم کونسی کتابیں پڑھ رہی ہو اُن کی فہرست بھیجو —— !"

اُس نے جو لسٹ بھیجی وہ ساری کی ساری تصوّف اور منطق کی کتابیں تھیں —— روحانیت کے قصّے تھے۔

آخر میں لکھا :

حسین! پاپا کے پاس ایک بڑے نفیس بزرگ آیا کرتے ہیں —— اللہ اللہ ان کا نورانی چہرہ
میں گھنٹوں بیٹھی ان سے سلوک و طریقت کی باتیں سنتی ہوں —— میں نے دنیا کو اس نظر سے پہلے تو کبھی نہ دیکھا تھا ——"

میرے دِل میں ایک خطرے نے سر اٹھایا —— اور میں نے جھٹ قلم اٹھا کے موتیا کو خط لکھ مارا ——

دیکھنا موتیا!
"کہیں پیروں فقیروں کے چکر میں نہ پھنس جانا تم پڑھی لکھی روشن دماغ عورت

ہو ـــــ کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس پر مجھے شرمسار ہونا پڑے ـــــ دنیا میں ہر قسم کی کتابیں ملتی ہیں ـــــ خود مطالعہ کرو۔"

اس کا جواب آیا۔

"وہ تم ڈر گئے حسین ـــــ!

دیکھا مرد کتنا بدگمان ہوتا ہے ـــــ؟

پاپا نے کہا تھا ـــــ میری جڑیں گھر کے آنگن میں دُور تک اتر جانی چاہئیں ـــــ اس کے لئے ضروری تھا ـــــ تمہارے اور میرے بہت سے عکس ہوتے اس گھر میں ـــــ؟

اب یہ کام مجھے تنہا کرنا ہے ـــــ

ثانی پاؤں پاؤں دوڑ رہا ہے ـــــ

اور فضاؤں سے پوچھتا ہے میرے پاپا کیسے ہیں؟

ڈرو نہیں!

اگر میں نے تمہیں پہچان لیا تھا تو ہر مَرد کو پہچان سکتی ہوں۔

یوں کہیں چراغ جل رہا ہو ـــــ

تو اُس سے اپنی بجھی ہوئی بتی کو روشن کر لینا کچھ بُرا نہیں۔

مُرید بھی تمہاری ہوں۔

اور اسیر بھی تمہاری!

اسیری کا تماشا دیکھنا چاہتے ہو

دیکھتے رہو ـــــ"

دو تین سال بعد میں ایک چکر لگا آیا کرتا ـــــ دو تین سال بعد ـــــ چند دن جو موتیا کی زلف کی چھاؤں میں گزرتے وہی میری زندگی کا حاصل بن جاتے ـــــ پھر رفتہ رفتہ زندگی کی سنگینی نے مجھ سے خوبصورت جذبے چھیننے شروع کر دیئے میرے چہرے اور گفتار میں کرختگی آگئی ـــــ میں اپنی پوری قوت سے تیز تر بھاگنے لگا۔

ان ہی دنوں موتیا کا خط آیا:

"وحسین! تم نے کہا تھا۔ تم جلد لوٹ آؤ گے۔ مجھے معلوم ہے کسی نہ کسی روز تم لوٹ آؤ گے ـــــ مگر وقت تو لوٹ کر نہیں آئے گا ـــــ

تم کہتے ہو۔ جذبے کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ یہ غلط ہے ـــــ

جذبے تھک جاتے ہیں تو قویٰ کی طرح مضمحل ہو جاتے ہیں اور مضمحل جذبوں کے ساتھ کون زندہ رہ سکا ہے ـــــ؟

ترس ترس کر کوئی چیز ملے تو اس کی دلکشی زائل ہو جاتی ہے ـــــ"

موتیا کے خطوں کا انداز بدلا ـــــ تو میں نے سنجیدگی سے گھر واپس آنے کے بارے میں سوچا۔

مگر وقت نے میرے دس سال لے لئے تھے ـــــ

جب میں وطن واپس آیا۔ تو میرا بیٹا ثانی دس برس کا تھا ـــــ میں نے اپنا ذہن اور سرمایہ کاروبار میں جھونک دیا ـــــ

یہاں بھی میں دن رات مصروف رہا ـــــ

اب میرا دوائیوں کا ایک کارخانہ ہے ـــــ

ایک بوتلوں کی فیکٹری ہے ـــــ

ایک گتہ ساز فیکٹری ہے ـــــ

میرے والد کا خواب پورا ہوا ـــــ میں نے وہ سب حاصل کیا جو سوچا تھا اور جو میری محنت مجھے دے سکتی تھی۔

پر یہ کیا ہوا ـــــ ؟

دل خالی ہو گیا ـــــ؟

حسین نے سارے خیالات جھٹک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پردہ ابھی تک ہل رہا تھا۔

جانے موتیا کس وقت باہر نکل گئی تھی۔

حسین دبے پاؤں چلتا ہوا لائبریری میں آ گیا۔ پردہ اُٹھا کے اندر داخل ہوا۔ دیکھا ـــــ

موتیا سامنے تخت پر تہجد کی نماز پڑھ رہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا ـــــ

پہلو میں بچی کھچی تمناؤں نے ایک چٹکی لی ـــــ

مسافر لوٹ آئے ہو تو کیا ـــــ ؟

یہاں ہر شے کی ایک قیمت ہوتی ہے ـــــ

وہاں جھروکے میں کھڑے ہو کر حسین نے سوچا۔

"عورت سرتاپا دل ہے ـــــ مگر جب پتیا کی منزل سے گزرتی ہے تو رُوح بن جاتی ہے۔ رُوح سے کوئی بھی جسم تسکین حاصل نہیں کر سکتا ـــــ! ہم مرد کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ ہم عورت کا دل بھری بہار میں روند ڈالتے ہیں اور پھر اُسے رُوح بن جانے کا طعنہ دیتے ہیں ـــــ"

محترم قارئین!

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں ہمیشہ سے آپ کا تعاون حاصل رہا ہے۔ آپ کے بھرپور تعاون اور سخن پروری کی بدولت ہم ہمیشہ خوبصورت اور معیاری کتب آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں اور انشاءاللہ کرتے رہیں گے۔

اس کمر توڑ مہنگائی کے دور میں جہاں پیٹ بھر کر روٹی کھانا مشکل ہو رہا ہے وہاں ایک کتاب کی خوبصورتی اور کاغذی پیرہن کے معیار کو برقرار رکھنا کس قدر کٹھن کام ہے، اس کا اندازہ آپ سب کو بھی ہے۔

مادہ پرستی کے اس دور میں جہاں ہر ممکن طریقے معیارِ زندگی کو بلند رکھا جا رہا ہے، ہم سارے وسائل کتاب کا معیار بلند کرنے پر لگا رہے ہیں اور آپ کے شکرگزار ہیں کہ آپ برابر ہمارا ساتھ دے رہے ہیں ——— باری تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور ہمیں ہمت اور توفیق عطا فرمائے! آمین۔

چاہتے تو ہم یہ ہیں کہ ہر ماہ آپ کی خدمت میں ایک نئی کتاب پیش کریں مگر کتابت کے مرحلے بڑے جانگسل ہیں ——— جو تھوڑی بہت تاخیر ہو جاتی ہے، اس کے لیے ہم آپ سے معذرت چاہتے ہیں ——— اور ہر قدم پر آپ کی دعاؤں کے طلب گار ہیں ———

آپ کے مخلص:

ادارہ "وطن دوست"